پاکستانی تاریخی کہانیاں

حصہ دوم

برائے جماعت ششم

مصنفہ
میاں عبدالحکیم صاحب بی۔اے۔بی۔ٹی
ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ دروازہ لاہور

منصور برادرز پبلشرز و تاجران کتب اردو بازار لاہور
١٩٤٩ء
بار دوم
قیمت

فہرست مضامین

عرضِ حال

مغربی پنجاب کے محکمۂ تعلیم نے علم تاریخ کا نصاب سکولوں میں بدل کر قوم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ افسران کو جزا دیں جماعت پنجم و ششم میں تاریخی کہانیوں کا اجرا نہایت ہی نیک قدم ہے کہ بچے چھوٹی عمر ہی میں اپنے مشاہیر کے نام اور ان کے مختصر کارناموں سے واقف ہو سکیں گے اس کتاب میں مشاہیر کی زندگیوں کو ایسے طریقے سے پیش کیا گیا ہے کہ بچے ان میں دلچسپی لے سکیں اور کہانیوں کو خود بخود پڑھ سکیں بچے ان کہانیوں کو پڑھ کر بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں کہ ان کے آباؤ اجداد میں کیسے کیسے مشہور عالم مشاہیر گزرے ہیں ان پر مسلمانوں کو ہمیشہ ناز رہا ہے۔ لیکن افسوس کہ عہدِ فرنگ میں ہمارے بچے ایسے اسباق سے محروم رکھے گئے۔ کہانیوں کے بیان میں تاریخی واقعات کی صحت کا خیال رکھا گیا ہے زبان آسان اور بامحاورہ ہے۔

اس سلسلہ میں چار کتب شامل ہیں:۔

حصہ اوّل پاکستانی تاریخی کہانیاں برائے طلبہ جماعت پنجم
حصہ دوم " " " " " " ششم
پاک تاریخ ہند (اوّل) برائے طلبہ جماعت ہفتم
" " " (دوم) " " " ہشتم

یہ چاروں کتب جدید ترین نصاب کے مطابق لکھی گئی ہیں

اور ان کتب میں تاریخی افسانوں کو جو پہلی درسی کتب
میں ٹھونسے جاتے تھے حذف کر دیا گیا ہے۔

اُمید ہے کہ اساتذہ کرام اور بچے ان کتب سے
فائدہ اُٹھائیں گے اور اپنے کیریکٹر کو اسلامی ڈھانچے
میں ڈھال سکیں گے۔ کسی قوم کی طاقت اس کے زر اور
مال پر نہیں ہے۔ بلکہ اس کی قوم کے افراد کے کیریکٹر
پر ہے اس وقت پاکستان کو بلند پایہ کیریکٹر کے مسلمانوں
کی ضرورت ہے۔ تاکہ یہ ملک جلد از جلد دنیا کی مضبوط
ترین طاقتوں میں سے ایک بن سکے۔

مصنّف

حصّہ دویم

حضرت نُوح علیہ السّلام

خدائے قدوس نے جو اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے اور ان کی نافرمانی وبد کرداری کو پسند نہیں فرماتا حضرت آدم علیہ السلام کی دنیا میں تشریف آوری کے تقریباً ڈیڑھ ہزار برس بعد حضرت نُوح علیہ السلام کو نبوت عطا فرمائی تا کہ لوگوں کو راہِ راست پر لائیں۔

حضرت نُوح علیہ السلام حضرت ادریس علیہ السلام کے پڑپوتے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے گمراہوں کو خدا تعالیٰ کا پیغام سُنانا اور سچائی کی طرف بُلانا شروع کیا۔ اور ایک عرصۂ دراز تک بُت پرستی کی برائیاں اور خدا پرستی کی خوبیاں بیان کرتے رہے۔ لیکن سوائے چند غربا مساکین کے جن کی تعداد زیادہ سے زیادہ اسّی تھی۔ اور کوئی آپ پر ایمان نہ لایا۔

آپ وعظ کرتے تو اکثر دولت کے نشے میں مخمور بت پرست آپ کا مذاق اُڑاتے۔ اور طرح طرح کے طعنے دیتے۔ کہ میاں تمہاری یہ بات ایسی نامعقول ہے کہ کوئی سمجھدار

اور باعزت شخص اس کو سُننا بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ تمہارے پیچھے لگنے والے صرف وہی ہیں جو بالکل بے سمجھ اور بے قدر ہیں۔

آپ فرماتے کہ میں تمہیں نیکی کی طرف بلاتا ہوں۔ بُرے کاموں اور اُن کے بُرے نتائج سے ڈراتا ہوں۔ اور اس وعظ و نصیحت کے بدلے تم سے کوئی انعام یا اُجرت نہیں مانگتا۔ بلکہ صرف اللہ سے اس محنت کا صلہ چاہتا ہوں۔

لیکن جیسا کہ دنیا کے عام سرکشوں اور سنگ دلوں کا دستور ہے ان کفّار پر آپ کی ان سیدھی سادی باتوں کا مطلق اثر نہ ہوتا آپ کی نرم نرم گفتگو پر گرم گرم باتیں کرتے۔ جب حضرت نوحؑ کی صاف اور سچی باتوں کے مقابلہ میں لاجواب ہو جاتے تو کہہ دیتے کہ میاں صاحب تم تو جھکی ہو ہمیں یہ جھک آتی نہیں جس عذاب کا تم بار بار ڈراوا دیتے ہو جاؤ وہ عذاب لے آؤ۔

حضرت نوح علیہ السّلام نے جب دیکھا کہ میرے وعظ و تبلیغ کا ان پر مطلق کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ اُلٹی مخالفت روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے تو ایک دن تنگ آ کر جنابِ باری تعالیٰ میں نہایت اضطرار و بیقراری کی حالت میں دعا کی دو

"خدایا میں نے اپنی قوم کو ہر چند سمجھایا رات دن
ان کے لئے سر کھپایا مگر جس قدر میں نے ان
کو اپنی طرف کھینچنا چاہا یہ اُسی قدر مجھ سے کھنچتے چلے
گئے۔ غلنا میں نے ان کو اپنے سے مانوس کرنا چاہا
یہ اُتنا ہی مجھ سے رمنے گئے۔ میں ان کو سمجھاتا ہوں
اور یہ کانوں میں انگلیاں گھسا لیتے ہیں۔ پھر میں
چلاّ چلاّ کر اُن کو سمجھاتا ہوں، مجمعوں میں کھڑا ہو
کر سمجھایا ایک ایک کو علیحدہ ہو ہو کر بتایا غرضیکہ
میں نے وعظ و نصیحت کا کوئی طریقہ اُٹھا نہیں
رکھا میں سمجھاتا سمجھاتا تھک گیا۔ مگر انہوں نے
میرا کہنا نہ مانا اے اللہ اب مجھے یقین ہو چکا ہے
کہ ان کے پتھر دلوں میں تیری توحید کا پودا نہیں
پھلے گا اور یہ کبھی ایمان نہ لائیں گے۔ اے اللہ
تو انہیں ایسا تباہ و برباد کر دے کہ صفحۂ عالم پر
ان کا نشان بھی باقی نہ رہے۔ کیونکہ اگر ایک شخص
بھی ان میں سے زندہ رہا تو ان کی اولادیں بھی
ایسی ہی بے ایمان کافر و بدکار ہوں گی۔"

وہ بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے"

اور پھر اللہ والے کے دل سے نکلی ہوئی بات
اور اللہ والا بھی اللہ کا پیغمبر اور جلیل القدر
اور رسول بھی مظلوم۔ پھر کیسے اثر نہ
کرتی۔ مظلوم تو کوئی ہو اس کی تو ایک آہ
ظالم کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے یہ تو خدا کے

مقدس پیغمبر کے پاک معصوم مظلوم دل سے نکلی ہوئی آہ تھی۔ آسمانوں کو چیرتی ہوئی عرش اعظم سے ٹکرائی اجابت و قبولیت سے ہمکنار ہو کر اس بد بخت قوم پر تباہی و بربادی کے تمام سامان اپنے ساتھ لے کر واپس آئی۔

خدائے جبار کے دریائے قہر میں جوش آیا۔ فرما دیا اے نوح گھبراؤ نہیں اگر یہ کم نصیب ہمارے پیغمبر کے ارشادات کو سنتے نہیں بلکہ مذاق اُڑاتے ہیں۔ ہدایت کی نعمتِ عظمیٰ کی بے قدری کرتے ہیں اور ٹھکراتے ہیں تو ہم ایسے ناشکروں ناقدر شناسوں سے ہدایت حاصل کرنے کی قوت ہی سلب کئے لیتے ہیں۔ بس اب تک جو لوگ ایمان لا چکے سو لا چکے اب آئندہ کوئی ایمان نہیں لائے گا۔ ان کی اس شورہ پشتی اور کور باطنی سے گھبراؤ نہیں ان کی تباہی و بربادی قریب تر ہے تم ایک کشتی بناؤ اب ہم سوائے تیرے ماننے والوں اور اہل و عیال کے ان تمام نابکاروں کو غرق کرنے والے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اِرشادِ خداوندی کے مطابق جبرائیل علیہ السلام کی تعلیم سے کشتی بنانا شروع کی۔ توریت میں لکھا ہے کہ اس کشتی کا طول تین سو ہاتھ عرض پچاس

اور بلندی تیس ہاتھ تھی۔ اس کے تین درجے تھے۔ اور اس میں کئی روشن دان کھڑکیاں دروازے اور کوٹھڑیاں بھی تھیں۔

کفّار حضرت نوحؑ کو کشتی بناتے دیکھ دیکھ کر خوب مذاق اڑاتے اور کہتے کہ سچ مچ نوحؑ تو (معاذ اللہ) بالکل دیوانہ ہے۔ آپ پروا نہ کرتے اور فرماتے کہ آج جس طرح تم ہم پر ہنس رہے ہو، دیکھتے رہو عنقریب اس سے زیادہ ہم تم پر ہنسیں گے۔

الغرض کشتی تیار ہو گئی اور غضبِ الٰہی کا وقت بھی آن پہنچا۔ خدا تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو فرما دیا کہ اے نوحؑ اپنے کنبے والوں اور ایمان داروں کو اس میں سوار کر لو اور ہر قسم کے جانور کا ایک ایک جوڑا بھی ساتھ لے لو۔ اپنے کھانے اور پہننے کا سامان بھی کشتی میں رکھ لو۔ اور دیکھو اب خدائے قدّوس کی قدرت و طاقت ان نافرمانوں کے ساتھ کیا معاملہ کرتی ہے؟

حضرت نوحؑ نے تعمیل کی۔ اور جس جس کے سوار کرنے کا حکم دیا تھا۔ کشتی میں بٹھا لیا۔ آپ کے چار بیٹے تھے۔ حام، سام، یافث، کنعان ان میں سے کنعان آوارہ۔ نالائق اور بدچلن تھا۔ کافروں کے ساتھ نشست و برخاست دوستی و محبت تھی۔ صحبت اپنا اثر ضرور دکھاتی ہے۔ بڑوں کی

صحبت میں بیٹھ کر نیکی نہیں آتی - جب آپ نے اس سے کہا کہ آ بیٹا تو بھی کشتی میں سوار ہو جا تو بے پروائی سے کہنے لگا کہ آپ کشتی میں سوار ہو جائیں - میں کسی نہ کسی طرح اپنی جان بچا لوں گا - زمین پر پناہ نہ ملی تو پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا آپ نے ہر چند سمجھایا کہ برخوردار خدا کے قہر وعذاب سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی - حفاظت اور بچاؤ کا جو طریقہ خدائے قدوس نے بتایا ہے - اس کے سوا اور کوئی طریقہ مفید نہیں ہو سکتا - آجا کشتی میں سوار ہو جا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فرما دیا ہے کہ وہی باقی بچیں گے جو کشتی میں سوار ہو جائیں گے - باقی سب غرق کر دیئے جائیں گے - لیکن کنعان پر تو بری صحبتوں کا رنگ چڑھا ہوا تھا - کافر دوستوں کی بکواس اور بد عقیدگی کا بھوت سوار تھا وہ نبی کی بات کب ماننے لگا تھا - نہ مانا - اور سوار نہ ہوا -

خدائے قدوس کا وعدہ - ان نافرمانوں کی تباہی و بربادی کا وقت آ گیا - اُدھر آسمان سے موسلادھار بارش کا ریلا چلا ادھر زمین پر تنور نے جوش مارا - زمین کے سوتے پھٹ گئے اور رگ رگ سے چشمے پھوٹ نکلے - دم کے دم میں پانی چڑھ گیا - حتیٰ کہ جو اونچے سے اونچا پہاڑ تھا - پانی اُس سے

بھی پندرہ ہاتھ اوپر چڑھ گیا۔ خدا کے نافرمان اور نبی کی گستاخ قوم ساری کی ساری غرق ہو گئی اور کنعان بھی اپنے یاروں کے ساتھ ڈوب مرا۔

حضرت نوحؑ نے جب دیکھا کہ کنعان غرق ہو رہا ہے تو شفقتِ پدری نے جوش مارا باری تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا خدایا تیرا وعدہ ہے کہ تو میرے خاندان والوں کو غرق ہونے سے بچا لے گا۔ الٰہی یہ کنعان میرا بیٹا ہے اسے بھی بچا لے۔ وہاں سے نہایت تہدید آمیز خطاب ہوا۔ "نوحؑ! تمہیں معلوم نہیں کہ ہمارے دربار میں خاندانوں کی پوچھ نہیں ہم عمل کو دیکھتے ہیں۔ اس کا عمل اگر کفار جیسا ہے۔ تو پھر تمہارا باپ ہونا اُسے نہ بچا سکے گا۔ جس جرم میں وہ نافرمان غرق ہو رہے ہیں۔ جب یہ بھی وہی جُرم کر رہا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ بھی وہی سزا نہ بھگتے۔ نوحؑ ہمارے قانون میں خاندانی وجاہتیں نہیں اور تعلّقات نجات نہیں دیتے۔ یہاں عزت و وقار کا دار و مدار عمل اور نیکی پر ہے۔ اپنے دوستوں کے ساتھ جہنّم رسید ہو۔"

خدائے قُدّوس جب کفّار کو ان کی بدکرداریوں کی وجہ سے فنا کر چکا تو اس کے حکم سے زمین و آسمان کا پانی چالیس روز کے بعد بالکل بند ہو گیا۔ اور سات مہینے کے بعد حضرت نوحؑ کی کشتی ایک پہاڑ پر آ کر ٹھیری۔ یہ پہاڑ عراق

عرب میں موصل کے قریب واقع ہے اور آج کل ارارات کے نام سے مشہور ہے۔

حضرت نوحؑ کچھ عرصہ کے بعد جب زمین خشک ہو گئی معہ ہمراہیوں کے نیچے تشریف لائے اور زمین میں رہنے سہنے لگے۔ خدائے قدوس نے پیداوار میں اور ان کی اولاد میں بہت زیادہ برکت عطا فرمائی اور ان کی نسلیں جلد جلد بڑھنے پھولنے اور پھلنے لگیں۔

طوفان کے وقت سیدنا نوحؑ کی عمر ۶۰۰ سال کی تھی۔ ۳۵۰ برس بعد میں زندہ رہے کھیتی باڑی بھی اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ اور وعظ و نصیحت بھی برابر کرتے رہے۔ بالآخر ۹۵۰ ساڑھے نوسو سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

واللہ تعالے اعلم بالصواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

آج سے چودہ سو سال پہلے ساری دنیا کی مذہبی حالت بڑی خراب تھی۔ کہیں پتھروں کے خدا بنائے جا رہے تھے۔ کہیں آگ کو سجدہ کیا جا رہا تھا۔ کہیں چاند سورج کی پرستش ہو رہی تھی اور ہر ملک اور ہر قوم نے اپنے خدا الگ الگ بنا رکھے تھے۔ ساری دنیا کی حالت تو خراب تھی ہی مگر عرب کے ملک میں حالت سب سے زیادہ ابتر تھی۔ کوئی گناہ اور کوئی بُرا کام ایسا نہ تھا جو وہاں نہ ہوتا ہو۔ ہر گھر میں ایک بُت رکھا ہُوا تھا۔ بلکہ ہر شخص اپنی آستین یا جیب میں اپنے پتھر کے خدا کو لیے پھرتا تھا۔ جب چاہا نکالا اور اُس کے آگے سجدہ کر لیا۔ سارے عرب میں کوئی ایک شخص بھی خدا کا نام لینے والا اور اُس کی عبادت کرنے والا نہ تھا۔ خدا کی عبادت تو کوئی کیا کرتا۔ ہزاروں برس پہلے یہاں دو پیغمبروں نے جن کا نام حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ تھے۔ خدا کی عبادت کے

لیئے ایک مسجد بنائی تھی۔ جس کا نام کعبہ تھا۔ مگر اُس مسجد میں بھی ظالموں نے ایک دو نہیں اکھٹے تین سو ساٹھ بُت لا کر رکھ دیے تھے، جو دن رات پوجے رہے تھے۔

مذہبی حالت کے علاوہ عرب کے لوگوں کی اخلاقی حالت بھی اس درجہ ابتر تھی جس کی حد نہیں۔ لوٹ۔ مار۔ ڈاکہ زنی۔ قتل و غارت۔ جھوٹ۔ فریب۔ مکاری عیاری میں وہ طاق تھے۔ شراب اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔ یتیموں کا مال کھاتے۔ غریبوں پر ہر قسم کے ظلم توڑتے۔ غلاموں کو جانوروں سے بدتر سمجھتے عورتوں کو نہایت ذلیل جانتے۔ لڑکی کو پیدا ہوتے ہی زندہ گاڑ دیتے۔ معمولی معمولی باتوں پر اُن میں تلوار کھچ جاتی۔ جس میں بیسیوں قبیلے کٹ مرتے۔ جنگ شروع ہوتی تو پچاس پچاس برس تک، ختم ہونے میں نہ آتی۔ جس میں سینکڑوں خاندانوں کا صفایا ہو جاتا۔ غرض وہ شہروں میں جنگلوں کے خونخوار بھیڑیوں سے بھی زیادہ خوفناک تھے۔

تعلیمی حالت یہ تھی کہ لکھنے پڑھنے کو عیب سمجھتے اور اسے غلاموں کا کام جانتے تھے۔ جاہل رہنے پر فخر کرتے اور نرے گنوار کالٹھ واقع ہوئے تھے۔

معاشرتی حالت کے لحاظ سے بھی وہ صفر تھے۔ کوئی تہذیب و تمدن کی بات اور کوئی شائستگی اُن میں نہ تھی۔

بکریاں چراتے اور خیموں میں رہتے تھے - غرض ہر قسم کے تمدّن اور اخلاق سے عاری تھے اور برائیوں کے سوا اُن میں کوئی بھلائی نہ تھی - دن رات گناہ کی زندگی میں مبتلا رہتے تھے - اور اسی حالت میں خوش تھے - اس بدترین حالت کے باوجود اُن کے فخر اور تکبّر کا یہ حال تھا - کہ اپنے علاوہ ساری دنیا کو عجم یعنی گونگا کہتے تھے -

جب عرب اور ساری دنیا کی حالت اس قدر بگڑ گئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی بھلائی اور بہتری کے لیئے اُن میں ایک نبی کو پیدا کرنا چاہا جو اُن کی اصلاح کرے اور اُن کی ساری برائیاں بھلائیوں سے بدل دے - اُن کو بتائے کہ تمہارا ایک ہی معبود اور ایک ہی خدا ہے - اور وہی پرستش کے قابل اور عبادت کے لائق ہے - اُس کے سوا آسمان و زمین میں اور کوئی خدا نہیں - ساری مرادیں اور ساری آرزوئیں اُسی سے مانگنی چاہیئں - اور اُسی کے آگے اپنے سر کو جھکانا چاہیئے -

یہ نبی حضرت رسول کریم محمّد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم تھے - جو آج سے ۱۳۷۸ سال پہلے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ۵۷۱ برس بعد عرب کے مشہور شہر مکّہ میں پیدا ہوئے - آپ کے والد کا نام عبداللہ اور والدہ کا نام آمنہ تھا -

عرب میں بہت سے خاندان اور بہت سے

قبیلے آباد تھے۔ سب سے بڑا اور معزّز خاندان قریش تھا۔ قریش کے خاندان میں سب سے معزّز قبیلہ "بنو ہاشم" تھا۔ ہمارے حضرت اسی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ قبیلہ کے سردار عبدالمطلب آپ کے دادا تھے۔

آنحضرتؐ کے پیدا ہونے سے چار پانچ مہینے پہلے آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ یعنی جب آپ پیدا ہوئے تو یتیم تھے۔ جس وقت آپ کی پیدائش کی خبر دادا کو ہوئی تو وہ آئے یتیم پوتے کو گود میں اُٹھایا۔ اُسے پیار کیا۔ اور اُس کا نام محمدؐ رکھا۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے بچّے کا نام محمدؐ کیوں رکھا کوئی اور نام رکھا ہوتا۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ محمدؐ کے معنی ہیں ایسا انسان جس کی بے حد اور بے انتہا تعریف کی جائے۔ میری یہ تمنّا ہے کہ میرا یہ بیٹا بڑا ہو کر دنیا جہان میں مشہور ہو اور ایسا نیک اور اچّھا آدمی بنے کہ ہر شخص اس کی تعریف کرے۔

دیکھو عبدالمطلب کی یہ خواہش کیسے زبردست طریقہ سے پوری ہوئی۔ آج تک دنیا میں کسی پیر پیغمبر کی اتنی تعریف نہیں کی گئی جتنی ہمارے حضرتؐ کی ہو رہی ہے۔ اور قیامت تک ہوتی رہے گی۔ مسلمانوں کا ہر شخص خواہ چھوٹا ہو یا

بڑا - ادنیٰ ہو یا اعلیٰ نوجوان ہو یا بوڑھا - عورت ہو یا مرد ساڑھے تیرہ سو برس سے پانچوں وقت نمازوں میں کئی کئی دفعہ آنحضرتؐ پر درود بھیجتا ہے - اور جب تک دنیا ختم ہوگی برابر بھیجتا چلا جائے گا - بتلاؤ اس سے زیادہ تعریف کسی انسان کی کیا ہوگی؟ پھر ہر سال میلاد کی مجلسیں بڑے زور و شور کے ساتھ ساری دنیا میں ہوتی ہیں - جن میں حضور کی بے حد تعریف کی جاتی ہے - اور آپ کے کارنامے بیان کیئے جاتے ہیں - اس کے علاوہ دنیا کی ہر زبان میں ہمارے حضورؐ کی اس قدر کثرت کے ساتھ سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں جن کا شمار ناممکن ہے ان میں آپ کی بے انتہا تعریف کی گئی ہے -

آنحضرتؐ کی سوانح عمریاں ہزاروں نہیں لاکھوں لکھی گئی ہیں - اور برابر لکھی جاتی رہیں گی - اس سے بڑا ثبوت آنحضرتؐ کی تعریف کا اور کیا ہوگا -

عرب میں دستور تھا کہ شریف - معززؐ اور امیر آدمی اپنے بچوں کو دودھ پلانے اور پرورش کرنے کے لیئے دیہات میں بھیج دیا کرتے تھے - ہر سال دیہات سے دودھ پلانے والیاں مکہ میں آتیں - اور امیروں کے بچوں کو لے جاتیں - دیہات کی کھلی آب و ہوا میں ان بچوں کی صحت بہت

اچھی رہتی۔ دیہات کی زبان بھی اُن دنوں شہروں کی بولی سے اچھی ہوتی تھی اور بچے دیہاتیوں میں رہ کر بہت فصیح و بلیغ عربی بولنے لگتے تھے۔ جب دائیاں بچوں کو واپس لاتیں تو ماں باپ اُن کو بہت کچھ انعام و اکرام دیتے اور وہ خوش خوش واپس چلی جاتیں۔ جس سال آنحضرتؐ پیدا ہوئے اُس سال بھی بہت سی دودھ پلانے والیاں دیہات سے آئیں اور امیروں کے بچوں کو سنبھال لیا۔ مگر آمنہ کے لال کی طرف کسی نے بھی توجہ نہ کی۔ کیونکہ آمنہ کے پاس دینے کو کچھ نہ تھا۔ پس یتیم اور غریب بچے کو کون لینے آتا۔ حضرت آمنہ اس بات سے بہت غمگین تھیں اور دل میں سوچ رہی تھیں کہ اگر آج بچے کا باپ زندہ ہوتا اور ہمارے پاس دولت ہوتی تو کوئی دائی آ کر میرے بچے کو بھی لے جاتی۔ اتفاق کی بات ایک دائی تھی حلیمہ۔ اُسے پیچھے رہ جانے کی وجہ سے بہت تلاش پر بھی کسی امیر کا بچہ نہ ملا۔ تو اُس نے سوچا کہ بیکار سے بیگار بھلی۔ لاؤ عبداللہ کے یتیم ہی کو لے چلو۔ اگر خالی ہاتھ واپس گئی تو عورتیں مذاق اُڑائیں گی۔ یہ سوچ کر وہ حضرت آمنہ کے پاس آئیں اور بچے کے لیئے درخواست کی۔ حضرت آمنہ نے

فرمایا "بچے کو تو شوق سے لے جاؤ مگر میرے پاس تمہارا معاوضہ دینے کو کچھ نہیں ہے"۔ حلیمہ نے کہا "میں اس خیال سے نہیں آئی تم تو مجھے صرف بچّہ دے دو۔ اس پر حضرت آمنہ نے اُسے بچّہ دے دیا اور وہ چلی گئی۔ حلیمہ غریب عورت تھی۔ اُس کے ہاں جو بکریاں تھیں اُن کے تھنوں میں بھی دودھ نہ رہا تھا۔ بیچاری بہت مشکل سے بسر کرتی تھی مگر آنحضرتؐ کے جاتے ہی اس کا گھر برکتوں سے بھر گیا۔ بکریوں کے تھنوں میں دودھ بھی آ گیا اور ویسے بھی زندگی بہت آرام سے کٹنے لگی۔ ننھے بچّے کی شکل بھی ایسی پیاری اور بھولی بھالی تھی کہ حلیمہ کو آپ سے بڑی محبت ہو گئی اور وہ آپ کو اپنے بیٹوں سے زیادہ چاہنے لگی۔ پانچ سال تک حضورؐ حلیمہ کے پاس رہے۔ پھر حلیمہ ان کو مکہ لاکر ان کی والدہ کے سپرد کر گئیں مگر ابھی آپ کو گاؤں سے آئے ہوئے ایک ہی سال گزرا تھا کہ حضرت آمنہ کا انتقال ہو گیا۔

اب آپ کی پرورش آپ کے دادا نے اپنے ذمہ لی۔ مگر دو برس کے بعد وہ بھی وفات پا گئے۔ اس وقت حضورؐ کی عمر آٹھ برس کی تھی

دادا کے بعد آپ اپنے چچا ابوطالب کے پاس رہنے لگے۔ ابوطالب جب تک زندہ رہے بہت ہی محبّت کے ساتھ بھتیجے سے پیش آتے رہے۔ یہاں تک کہ اپنے بچّوں سے بھی زیادہ وہ آپ کا خیال رکھتے تھے۔ مگر آنحضرتؐ کی بھی عادتیں ایسی اچھّی تھیں کہ غیروں تک کو آپ پر پیار آتا تھا۔ نہ کسی بات پر مچلتے نہ ضد کرتے۔ نہ بازاروں اور گلیوں میں آوارہ پھرتے۔ نہ اپنے ہم جولیوں سے کبھی لڑتے جھگڑتے۔ نہ کسی سے بدکلامی اور بدتہذیبی سے پیش آتے۔ جو کچھ دیا جاتا کھا لیتے جو کچھ ملتا پہن لیتے۔ خود کوئی چیز نہ مانگتے جھوٹ، کبھی نہ بولتے۔ اپنے ہم عمروں کے ساتھ بڑی محبّت سے رہتے۔ شروع سے نہایت غیرت مند۔ خوددار اور تنہائی پسند تھے۔ بچپن میں آپ کے دوست بہت کم تھے مگر جو تھے اُن سے آپ بہت ہی خلوص سے ملتے تھے۔ بچپن کے دوستوں کے دلوں میں بھی آپ کی نیکی کی وجہ سے آپ کی بڑی قدر و عزّت تھی۔

جب حضورؐ جوان ہوئے تو گزر اوقات کے لیے آپ نے تجارت کے پیشہ کو پسند فرمایا۔ مختلف قسم کا مال لے کر دوسرے ملکوں میں بیچ آتے اور وہاں سے مال لاکر مکہ میں فروخت کر دیتے۔ چونکہ آپ کے اپنے پاس

روپیہ نہیں تھا۔ اس لیئے آپ لوگوں کے ساتھ مل کر اور منافع میں شریک ہو کر کام کیا کرتے تھے۔ آپ نہایت ایمان دار۔ وعدے کے سچے اور معاملہ کے کھرے تھے۔ تجارت میں جو جو حصّہ دار آپ کے بنے اُن میں سے کسی کو بھی کبھی آپ سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ کسی کا ایک پیسہ بھی آپ نے کبھی نہیں مارا۔ نہ کبھی کسی کو آپ کی امانت اور دیانت پر شبہ ہوا۔ نہ کبھی کسی ساجھی سے آپ کا کوئی جھگڑا ہوا۔ گاہکوں سے آپ بہت ہی خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے۔ منافع تھوڑا لیتے۔ اور سودا زیادہ دیتے تھے۔ چیز میں کوئی نقص ہوتا تو صاف طور پر کھول کر بتا دیتے تھے۔ قیمت زیادہ بتانے کی آپ کو عادت نہ تھی۔ جو مُنہ سے کہہ دیتے تھے، وہی لیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت ہی جلد آپ کی امانت۔ دیانت سچائی۔ خوش معاملگی اور اخلاق کی شہرت سارے شہر مکّہ اور آس پاس کے علاقوں میں ہو گئی۔ کوئی آپ کا نام نہ لیتا بلکہ ہر شخص صادق اور امین کے خطاب سے آپ کو یاد کرتا۔ لوگ اپنے روپے پیسے آپ کے پاس رکھوا جاتے اور آپ پر پورا اعتبار کرتے تھے۔ مکّہ کا ہر آدمی آپ کی عزّت کرتا تھا۔ اور جب کبھی دو آدمیوں میں جھگڑا ہوتا تو وہ

آپ ہی کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتے اور جو کچھ آپ فیصلہ کرتے اُسے خوشی سے قبول کیا کرتے تھے۔

مکہ میں خدیجہ نام ایک خاتون تھیں جو عرب بھر میں سب سے مال دار تھیں۔ یہ لوگوں کو تجارت کا مال دے کر دور دور بھیجا کرتی تھیں اور جتنا منافع ہوتا اُس میں سے کچھ اُن کو دے دیا کرتی تھیں۔ انہوں نے حضورؐ کی شہرت سُنی تو اپنے بھتیجے کو آپ کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ "اگر آپ میرا مال لے کر بیچنے کے لیئے باہر لے جائیں تو جو منافع میں دوسروں کو دیتی ہوں آپ کو اُس سے دوگنا دوں گی"۔ آپ نے اس بات کو منظور فرمالیا۔ خدیجہ نے بہت سامان آپ کو دیا۔ اور اپنے غلام میسرہ اور اپنے ایک رشتہ دار کو ساتھ کر دیا۔ سارا مال بہت جلدی بک گیا۔ اور اُس میں نہایت معقول منافع ہُوا جو آپ نے کوڑی کوڑی لا کر خدیجہ کے حوالے کر دیا۔ میسرہ نے سفر سے واپس آکر خدیجہ سے آپ کے سلوک کی بے حد تعریف کی۔ اور کہا کہ ہم نے ساری عمر میں ایسا خوش اخلاق۔ ایسا ملنسار۔ ایسا دیانت دار۔ اور اتنا سچا اور کھرا آدمی اور کوئی نہیں دیکھا۔ انسان نہیں یہ شخص تو فرشتہ ہے۔ اس پر خدیجہ نے نفیسہ نام ایک عورت کے

ذریعہ حضورؐ کے چچا ابوطالب کے پاس آپ سے اپنی شادی کا پیغام بھیجوایا۔ جسے ابوطالب نے منظور کر لیا۔ اور خدیجہ سے حضور کی شادی ہو گئی۔ خدیجہ کی یہ تیسری شادی تھی۔ اس سے پہلے اُن کے دو شوہروں کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس تیسرے نکاح کے وقت خدیجہ کی عمر ۴۰ برس کی اور حضور کی عمر ۲۴ برس کی تھی۔

شادی کے بعد خدیجہ نے حضورؐ کی ایسی خدمت اور اطاعت کی کہ دنیا میں کسی عورت نے اتنی فرماں برداری اپنے خاوند کی نہ کی ہو گی۔ انہوں نے اپنا سب کچھ آپ پر قربان کر دیا۔ جتنا روپیہ پیسہ پاس تھا سارا شوہر کے قدموں میں ڈال دیا اور کہا کہ اس سب کے آپ مالک ہیں۔ جس طرح چاہیں خرچ کریں۔ حضور نے وہ ساری دولت غریبوں مسکینوں یتیموں اور بیواؤں میں تقسیم کر دی اور اپنے آپ غریبوں کی طرح زندگی بسر کرنے لگے۔ مگر حضرت خدیجہ کو ذرا بھی اس کا خیال نہ ہوا۔ اور وہ نہایت وفاداری کے ساتھ برابر شوہر کی خدمت کرتی رہیں۔

جب حضورؐ کی عمر ۴۰ برس کی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے جبرئیل فرشتہ کو بھیج کر آپ پر وحی نازل فرمائی کہ ہم نے تم کو ساری دنیا کے لیئے

نبی بنایا۔ تم لوگوں کو بُت پرستی سے روکو اور بُرے کاموں سے منع کرو۔

حضورؐ نے جب اللہ تعالیٰ کے حکم کے بموجب لوگوں سے یہ بات کہی کہ یہ بُت بڑے پتّھر کے ٹکڑے ہیں کسی کو نفع نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اِن کو اُٹھا کر پھینک دو اور صرف خدائے واحد کی عبادت کرو جو ساری دنیا کا پیدا کرنے والا اور ہم سب کا مالک ہے تو یہ سُنتے ہی سارے آدمی آپ کے دشمن بن گئے۔ اور آپ کو طرح طرح کی تکلیفیں دینے لگے۔ کبھی آپ کو پاگل کہتے۔ کبھی جادوگر بتاتے لوگوں کو آپ سے بات کرنے کو منع کرتے۔ آپ کے راستے میں کانٹے بچھا دیتے۔ آپ کے گھر میں گندگی پھینک دیتے نماز پڑھتے ہوئے آپ کی پیٹھ پر اُونٹ کی اوجھڑی لا کر رکھ دیتے آپ کا گلا ایسے زور سے گھونٹتے کہ آنکھیں باہر نکل پڑتیں۔ پتّھر مار مار کر آپ کا سارا بدن لہو لہان کر دیتے مگر ان سب تکلیفوں پر آپ صبر کرتے اور برابر لوگوں کو سمجھاتے رہتے۔ آپ کے سمجھانے سے سب سے پہلے جو لوگ آپ پر ایمان لائے وہ یہ ہیں۔ آپ کی بیوی حضرت خدیجہؓ۔ آپ کے بچپن کے دوست حضرت ابوبکرؓ۔ آپ کے

چچیرے بھائی حضرت علیؓ اور آپ کے غلام حضرت زیدؓ۔ اُن کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ رفتہ رفتہ مسلمان ہوگئے۔

جو لوگ اسلام قبول کر لیتے تھے۔ مکّہ کے کافر اُن کو بھی ایسی سخت سخت تکلیفیں دیتے تھے۔ کہ سُن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آنحضرتؐ کا ایک بہت شدید دشمن تھا ابوجہل۔ اُس نے ایک صحابی کو مارتے مارتے اندھا کر دیا۔ حضرت عثمانؓ حالانکہ بہت امیر آدمی تھے مگر مسلمان ہونے پر اُن کے چچا نے رسیوں سے جکڑ کر اُن کو خوب مارا۔ حضرت زبیرؓ کو اُن کا چچا چٹائی میں لپیٹ دیتا اور پھر اُن کی ناک میں دھونی دیا کرتا تھا۔ حضرت ابوذر غفاری اور حضرت عبداللہ بن مسعود کو لوگ مارتے مارتے بے ہوش کر دیتے۔ حضرت خباب بن ارت کو ایک دن پکڑ کر انگاروں پر چت لٹا دیا۔ جس سے اُن کے بدن کی کھال جل کر کوئلہ ہو گئی۔ ایک مرتبہ ایک صحابی کو لوہے کا کرتہ پہنا کر دھکتی ہوئی آگ میں پھینک دیا

جب مکّہ میں مسلمانوں پر کفار کے ظلم ناقابل برداشت ہو گئے۔ اور اُن کا وہاں امن سے رہنا محال ہو گیا۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ جو لوگ جا سکتے ہوں وہ

ہجرت کر کے حبش میں چلے جائیں۔

حبش۔ افریقہ میں عرب کے قریب ایک ملک ہے۔ وہاں کا بادشاہ عیسائی تھا۔ اور اُس کا نام نجاشی تھا۔ اُس نے مسلمان مہاجرین کی بڑی آؤ بھگت کی اور مسلمان وہاں آرام اور امن سے رہنے لگے۔ یہ دیکھ کر مکّہ کے کافروں کو سخت غصّہ آیا۔ انہوں نے فوراً اپنے آدمی نجاشی کے پاس بھیجے کہ مسلمان ہمارے قیدی اور ہمارے غلام ہیں۔ ہمارے پاس سے بھاگ کر آپ کے ہاں آ گئے ہیں۔ ان کو واپس کر دیں۔ اور ساتھ ہی خوشامد میں بادشاہ کے لئے بہت سے اچھے اچھے تحفے بھی بھیجے۔ بادشاہ نے مسلمانوں کو بلا کر اُن سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ اُنہوں نے کہا کہ "بادشاہ نہ ہم ان کے غلام ہیں نہ قیدی۔ بات صرف اتنی ہے۔ کہ ہم بُتوں کو پوجتے اور طرح طرح کے بُرے بُرے کام کرتے تھے۔ خدا نے ہم پر مہربانی کی اور ہم میں ایک نبی پیدا کیا۔ جس کے سمجھانے سے ہم نے بُت پرستی چھوڑ دی اور خدائے واحد کی عبادت کرنے لگے۔ بس اسی وجہ سے یہ لوگ ہمارے دشمن بن گئے۔ اور ہم پر ہر قسم کے ظلم توڑنے لگے۔ مجبور ہو کر ہم پناہ لینے کے

لیئے آپ کے ہاں چلے آئے۔ مگر یہاں بھی اُنہوں نے ہمیں چین نہ لینے دیا۔ اور ہمارے پیچھے پیچھے یہاں تک پہنچ گئے ہ؛

اس تقریر سے نجاشی نے سمجھ لیا کہ مسلمان بالکل بے قصور اور مظلوم ہیں جس پر اُس نے قریش کے تحفے واپس کر دیئے اور کہلا بھیجا کہ میں مسلمانوں کو تمھارے حوالے نہیں کر سکتا۔

نجاشی کے اس جواب سے قریش کو اور بھی غصّہ آیا۔ اور اُنہوں نے پہلے سے زیادہ ظلم مسلمانوں پر کرنے شروع کیئے۔ سب نے جمع ہو کر مسلمانوں کا بائی کاٹ کر دیا۔ اور شہر میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ نہ کوئی مسلمانوں سے بات کرے۔ نہ اُنہیں کھانے پینے کی کوئی چیز مول دے۔ نہ اُن سے کوئی علاقہ رکھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم اپنے قبیلہ والوں اور مسلمانوں کو لے کر پہاڑ کی ایک گھاٹی میں چلے گئے اور وہاں تین سال تک اتنی سخت تکلیف اُٹھائی جس کی انتہا نہیں۔ نہ کھانے کو کچھ ملتا تھا نہ پینے کو۔ بچے بھوک کے مارے تڑپتے تھے۔ اور بڑے فاقے کر کر کے سوکھ گئے تھے۔ درختوں کے پتّے اور سوکھی روٹیوں کے ٹکڑے کھا کھا کے گزارہ کرتے اور اس قدر بدحال ہو گئے تھے کہ اُن کی شکلیں پہچانی

نہیں جاتی تھیں ۔ مگر اتنی تکلیفیں اُٹھانے کے باوجود ایک مسلمان بھی اپنے دین سے نہیں پھرا ۔ اور اس معاملہ میں مکّہ کے کافروں کی ساری کوششیں بیکار گئیں ۔

آخر قریش ہی کے بعض آدمیوں کو رحم آیا ۔ اُنہوں نے بائی کاٹ توڑ دیا ۔ اور مسلمان شہر میں واپس آ گئے ۔ مگر کافروں کے ظلم اُن پر کم نہ ہوئے بلکہ اُن میں زیادتی ہی ہوتی گئی ۔

مکّہ سے بہت دور پرے مدینہ ایک شہر ہے جسے پہلے یثرب کہتے تھے ۔ وہاں بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے تھے ۔ اب کے آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ لوگ یثرب چلے جائیں ۔ چنانچہ سارے مسلمان ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے ۔ بہت ہی تھوڑے سے صحابہ مکّہ میں رہ گئے ۔

یہ دیکھ کر مکّہ والوں نے سوچا کہ اگر محمدؐ بھی مکہ سے نکل کر مدینہ پہنچ گئے تو وہاں سے لشکر لے کر ہم پر چڑھ آئیں گے ۔ اس لیئے لاؤ ان کو یہیں قتل کر ڈالو ۔ یہ خیال کر کے تلواریں سونت سونت کر آگے بڑھے اور حضورؐ کے مکان کو گھیر لیا ۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو بچا لیا ۔ رات سخت اندھیری تھی اُن لوگوں کو آنحضرتؐ اپنے گھر سے نکلتے نظر نہ آئے ۔ اور آپ اُن لوگوں کے بیچ میں سے

ہوتے ہوئے باہر آ گئے۔
گھر سے نکل کر آپ فوراً حضرت ابوبکرؓ کے ہاں تشریف لے گئے اور اُن کو اپنے ساتھ لے کر مکّہ سے تین میل پرے ایک پہاڑ کی کھوہ میں جا چھپے جس کا نام غار ثور ہے۔ تین دن تک آپ وہیں چھپے رہے۔ اس کے بعد غار سے نکل کر مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور آٹھ دن میں مدینہ پہنچ گئے۔
جب مکّہ والوں نے دیکھا کہ محمدؐ بچ کر نکل گئے۔ تو اُنہوں نے ایک ہزار بہادروں کا ایک لشکر جمع کیا اور مدینہ پر حملہ کر دیا۔
نہایت ہی مجبور ہو کر آنحضرتؐ بھی مقابلہ کو نکلے آپ کے ساتھ صرف تین سو تیرہ آدمی تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے حضورؐ کو فتح دی اور قریش کے سارے بڑے بڑے سردار مارے گئے۔
اس سخت شکست کے بعد بھی قریش نچلے نہیں بیٹھے اور وقتاً فوقتاً برابر مدینہ پر حملہ آور ہوتے رہے علاوہ اس کے عرب میں رہنے والی ساری قوموں کو بھی اُنہوں نے بھڑکا دیا۔ اور سب مسلمانوں کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ آنحضرتؐ سب کا مقابلہ کرتے رہے اور سب کو شکست دیتے رہے۔ یہاں

تک کہ ایک دن ایسا آیا کہ مکّہ بھی فتح ہو گیا اور سارا عرب بھی آپ کا مطیع ہو کر مسلمان ہو گیا۔ مکّہ فتح کرنے کے بعد آپ نے اُن سب کافروں کو معاف کر دیا جنہوں نے آپ کو اور آپ کے ماننے والوں کو تکلیفیں دینے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نبی ہونے کے بعد تیرہ برس تک تو مکّہ میں رہے اور دس برس مدینہ میں۔ کل ٢٣ برس میں آپ پر خدا تعالیٰ کی طرف سے جو کلام بندوں کی ہدایت کے لیئے نازل ہوتا رہا۔ وہ سب حضوؐر نے ایک جگہ جمع کرا دیا۔ یہی قرآن شریف ہے جسے آج ہر مسلمان پڑھتا ہے۔ دنیا میں جتنی کثرت کے ساتھ قرآن شریف پڑھا جاتا ہے اتنی کوئی اور کتاب ہرگز نہیں پڑھی جاتی۔ لاکھوں آدمی تو دنیا میں ایسے موجود ہیں جن کو سارا قرآن زبانی یاد ہے۔

جب حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی عمر ٦٣ برس کی ہوئی تو حضور کا انتقال ہو گیا انتقال کے بعد آپ کو اُسی حُجرے میں دفن کر دیا گیا جس میں آپ کی وفات ہوئی تھی۔ آپ کا مزار مدینہ میں آج بھی موجود ہے۔ جس کی زیارت کرنے کے لیئے ساری دنیا سے ہزاروں مسلمان ہر سال مدینہ جاتے ہیں۔ اور قیامت تک جاتے رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے ہزار ہزار سلام ہوں حضور رسول اکرم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو دونوں جہانوں کے لیئے رحمت بن کر آئے اور ہدایت کا آفتاب بن کر اپنی روشنی سے ساری دنیا کو منور کردیا۔

اَللّٰھُمَّ اھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ط

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا

دنیا میں جس قدر بلند مرتبت اور مشہور عورتیں گزری ہیں۔ اُن میں حضرت خدیجہ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ آپ ہمارے پیارے آقا حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم کی سب سے پہلی بیوی تھیں۔

حضرت خدیجہؓ کی والدہ کا نام فاطمہ بنت زائدہ تھا۔ اور والد کا نام خویلد بن اسد۔ آپ کے اخلاق اور آپ کی عادتیں شروع ہی سے نہایت پاکیزہ اور بہترین تھیں۔ اس لئے جوانی ہی میں لوگ ان کو بجائے خدیجہ کے طاہرہ کہنے لگے تھے۔ طاہرہ کے معنی ہیں۔ نہایت پاک اور مقدّس عورت۔

حضرت خدیجہ ۵۵۵ عیسوی میں پیدا ہوئی تھیں۔ یعنی آپ عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے سولہ سال بڑی تھیں۔ جب جوان ہوئیں۔ تو باپ نے ایک صاحب سے جن کا نام ابو ہالہ تھا۔ آپ کا نکاح کر دیا۔ مگر تھوڑے دنوں بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ پھر عتیق نامی ایک شخص سے نکاح ہوا۔ لیکن جب وہ ایک لڑائی میں مارے گئے۔ تو حضرت خدیجہ نے ارادہ کرلیا۔ کہ اب اور شادی نہیں کروں گی۔ چنانچہ عرب کے بڑے بڑے آدمیوں نے اپنے پیغام بھیجے۔ مگر حضرت خدیجہ نے انکار کر دیا۔

حضرت خدیجہ نہایت مالدار اور دولتمند خاتون تھیں۔ عرب بھر میں ان سے زیادہ امیر اور کوئی نہ تھا۔ تجارت کرتی تھیں۔ اور ہزاروں روپیہ

کماتی تھیں۔ اپنا مال دے کر لوگوں کو مصر۔ شام۔ یمن اور فارس کے ملکوں میں بھیجا کرتی تھیں۔ جو کچھ منافع ہوتا۔ اس میں سے کچھ رقم اُن لوگوں کو دے دیتیں۔ اُن ایام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذہانت۔ امانت۔ معاملہ کی سچائی۔ اور اپنے پاکیزہ اخلاق کی وجہ سے سارے مکّہ میں مشہور تھے۔ یہ دیکھ کر خدیجہ نے حضور کو لکھ بھیجا۔ کہ "اگر آپ میرا مال لے کر تجارت کے لیئے باہر جائیں۔ تو جتنا معاوضہ میں دوسروں کو دیتی ہوں۔ آپ کو اُس سے دوگنا دوں گی"۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم۔ اُن کا مال ملک شام میں فروخت کرنے کے لیئے لے گئے۔ خدیجہ نے اپنا ایک غلام اور اپنا ایک رشتہ دار بھی آنحضرتؐ کے ساتھ کر دیا تھا۔ جتنا مال آنحضرتؐ لے گئے۔ سارا بہت جلدی بک گیا۔ اور اس میں بڑا منافع ہوُا۔ واپس آکر آپ نے کوڑی کوڑی کا حساب چکا دیا۔ اور اپنا معاوضہ لے کر چلے آئے راستہ میں جس قدر عمدہ برتاؤ آپ نے خدیجہ کے غلام اور اُن کے رشتہ دار سے کیا۔ اور جس عمدگی اور خوش معاملگی کے ساتھ آپ خریداروں سے پیش آئے۔ اُس کی تمام کیفیت غلام اور رشتہ داروں نے آکر حضرت خدیجہ سے کی۔ اور یہ بھی کہا۔ کہ ایسا نیک اور شریف انسان۔ اتنا سچا اور صادق آدمی۔ اور اس قدر خوش معاملہ اور خوش اخلاق شخص دنیا بھر میں کوئی نہ ہوگا۔ جیسے محمدؐ ہیں۔

حضرت خدیجہؓ نے خود بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو دیکھا تھا اور جو کیفیت غلام نے بیان کی تھی۔ وہ اس کا اپنی آنکھ سے معائنہ کر چکی تھیں جس کی وجہ سے اُن کے دل میں آنحضرتؐ کی نیکی۔ پارسائی اور اعلیٰ اخلاق کا سکّہ بیٹھ گیا تھا۔ انہوں نے چاہا۔ کہ میرا نکاح آنحضرتؐ کے ساتھ ہو جائے۔

عرب میں عورتوں کو اس بات کی پوری آزادی تھی۔ کہ وہ اپنے نکاح اور بیاہ کے متعلق خود بات چیت اور گفتگو کر سکتی تھیں۔ نہ اس بات سے

کوئی بُرا مانتا تھا۔ اور نہ اس امر کو کوئی بُرا جانتا تھا۔

اس دستور کے مطابق حضرت خدیجہؓ نے اپنی ایک رشتہ دار خاتون کو جن کا نام نفیسہ تھا۔ اس کام کے لئے مقرر کیا۔ انہوں نے آنحضرتؐ سے اور آپ کے دوسرے رشتہ داروں سے مل کر اس معاملہ کو طے کیا۔ آنحضرتؐ کی طرف سے تمام بنو ہاشم اور خدیجہ کی طرف سے اُن کے رشتہ دار اس نکاح میں شریک ہوئے۔ نکاح آنحضرتؐ کے چچا ابو طالب نے پڑھایا اور مہر ۵۰۰ درہم مقرر ہوا۔ نکاح کے وقت آنحضرتؐ ۲۴ برس کے تھے۔ اور حضرت خدیجہ کی عمر ۴۰ سال کی تھی۔

شادی کے بعد حضرت خدیجہ نے دیکھا۔ کہ آنحضرتؐ اُن کے وہم اور خیال سے بھی زیادہ نیک۔ صالح۔ پرہیزگار۔ اور پاکباز ہیں۔ اس پر انہوں نے اپنا سارا روپیہ پیسہ اور تمام دولت آنحضرتؐ کے حوالے کر دی۔ اور کہا۔ کہ یہ دولت حاضر ہے۔ جس طرح چاہیں۔ اُسے خرچ کریں۔

آنحضرتؐ چاہتے تو شادی ہونے کے بعد امیروں کی طرح عیش کرتے اور نہایت آرام کے ساتھ اپنی زندگی گزارتے۔ مگر آپ نے وہ ساری دولت بیواؤں کی امداد۔ یتیموں کی اعانت اور غریبوں کی خبر گیری میں خرچ کر دی۔ اور خود اس سے ذرا سا بھی فائدہ نہ اُٹھایا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم شروع میں بہت ہی تنہائی پسند اور گوشہ نشین آدمی تھے۔ نہ کسی سے ملتے۔ نہ عام طور سے مجلسوں میں بیٹھتے۔ نہ ناچ رنگ کی محفلوں میں شریک ہوتے۔ جو عرب میں عام تھیں۔ بلکہ آپ کا معمول تھا۔ کہ آٹھ سات روز کا کھانا تیار کرواتے۔ اور اُسے لے کر مکّہ سے قریب ایک سنسان اور تاریک پہاڑی کھوہ میں جا بیٹھتے۔ جس کا نام غارِ حرا تھا۔ جب کھانا ختم ہو چکتا تو پھر گھر چلے آتے۔ حضرت خدیجہ اور کھانا تیار کر دیتیں۔ اور اُسے لے کر آنحضرتؐ پھر غار میں تشریف لے جاتے۔

ایک روز اسی غار میں آپ بیٹھے تھے۔ کہ خدا نے اپنے فرشتہ جبریل کو بھیج کر آپ کو نبوّت کا منصب عطا کیا۔ اور فرمایا کہ ہم نے تمہیں ساری دنیا کے لئے نبی بنایا۔ تم لوگوں کو بتوں کے پوجنے سے روکو۔ اور خدائے واحد کی عبادت کی ترغیب دلاؤ۔

جب خدا نے حضورؐ کو نبی بنایا۔ اُس وقت آپ کی عمر ۴۰ برس کی تھی۔ اور حضرت خدیجہ کی ۵۶ برس کی۔

دنیا میں سب سے پہلے جو انسان آپؐ پر ایمان لایا۔ وہ حضرت خدیجہ تھیں وہ نہ صرف ایمان لائیں۔ بلکہ جب تک زندہ رہیں۔ نہایت ہی خلوص اور محبّت کے ساتھ آنحضرتؐ اور اسلام کی خدمت کرتی رہیں۔ یہی وجہ تھی۔ کہ آنحضورؐ کو اُن سے بیحد محبت تھی۔ اور اُن کی وفات کے بعد حضور ہمیشہ اُن کو یاد کیا کرتے تھے۔

نبوّت کا دعویٰ کرتے ہی قوم کے آدمی آنحضرتؐ کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ مگر یہ حضرت خدیجہؓ ہی کا اثر اور رسوخ تھا۔ کہ مکّہ کے کافر آپ کو زیادہ دُکھ اور تکلیف نہیں پہنچا سکتے تھے۔ لیکن جب ۱۰ ہجری میں حضرت خدیجہ کا انتقال ہوگیا۔ تو کفار نے بڑی سخت سخت تکلیفیں آپ کو دینی شروع کیں۔ یہاں تک کہ آپ کو جان سے مار ڈالنے کا ارادہ کیا۔ اور تلواریں سونت سونت کر آپ کو قتل کرنے کے ارادہ سے آپ کے گھر کو گھیر لیا۔ مجبوراً آپ کو مکّہ سے نکل کر مدینہ جانا پڑا۔

حضرت خدیجہ کے بعد آنحضورؐ نے مختلف اوقات میں دس عورتوں سے نکاح کئے۔ مگر اولاد سوائے ایک لڑکے حضرت ابراہیم کے ساری حضرت خدیجہؓ ہی سے ہوئی۔ حضرت زینب۔ حضرت رقیہ۔ حضرت اُم کلثوم اور حضرت فاطمہ زہرا آپ ہی کے بطن سے تھیں۔ جب تک حضرت خدیجہؓ زندہ رہیں۔ حضورؐ نے دوسری شادی نہیں کی۔

حضرت خدیجہ رضؓ طاہرہ اپنے اخلاق و عادات کے لحاظ سے بہت ہی بینظیر خاتون تھیں۔ اُن کی فضیلت کے لیئے یہ دلیل کافی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اپنے رسولؐ کے لئے انتخاب کیا۔ اور انہوں نے نہایت وفاداری کے ساتھ اپنی عمر اپنے مقدس شوہر کی خدمت و اطاعت میں گزار دی۔ اس سے زیادہ اُن کی بزرگی کا ثبوت کیا ہوگا۔ کہ فرشتے اُن کا ادب کرتے تھے۔ اور خدا تعالیٰ عرش سے اُن کو سلام کہلا کر بھیجتا تھا۔ ایک دفعہ حضرت جبریل جو فرشتے تھے۔ اور وحی لایا کرتے تھے۔ آنحضورؐ کے پاس بیٹھے تھے۔ کہ سامنے سے حضرت خدیجہ آتی دکھائی دیں۔ جبریل کہنے لگے۔ کہ "حضورؐ میرا اور خدا تعالیٰ کا سلام خدیجہ رضؓ کو پہنچا دیں"۔ اسی طرح ایک دن حضرت جبریل آنحضرتؐ کے پاس تشریف رکھتے تھے۔ کہ خدیجہ رضؓ بھی آگئیں۔ جبریل اُن کو دیکھ کر حضورؐ سے کہنے لگے۔ کہ "ان کو بہشت میں ایسا مکان ملنے کی خوش خبری سنا دیجئے۔ جو سارے کا سارا ایک موتی کا بنا ہوا ہے"۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ دنیا بھر میں سب سے افضل اور بہتر دو عورتیں ہیں۔ ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ حضرت مریم اور ایک خدیجہ۔ حضرت عائشہ جن سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ کے انتقال کے بعد شادی کی۔ فرماتی ہیں۔ کہ اگرچہ میں نے خدیجہ کو نہیں دیکھا۔ لیکن مجھے جتنا رشک اُن پر آتا تھا۔ اتنا کسی اور پر نہیں آتا تھا۔

حضرت خدیجہ رضؓ کی بیٹی حضرت فاطمہ کی نسل سے جو اولاد ہوئی۔ وہ سید کہلاتی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی ساری عمر میں گیارہ نکاح کئے مگر یہ سارے نکاح ایسی عورتوں سے ہوئے جو بیوہ تھیں۔ ان میں صرف حضرت عائشہ ایسی تھیں۔ جو کنواری ہونے کی حالت میں آنحضرت کے نکاح میں آئیں۔

ان کے والد کا نام ابو بکر صدیق اور والدہ کا نام زینب تھا جو اُمِ رومان کہلاتی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو نبی ہوئے چار برس گزرے تھے۔ کہ یہ پیدا ہوئیں۔ اور چھ سال کی تھیں۔ کہ ان کا نکاح آنحضرت کے ساتھ ہوگیا۔ چھ برس کی بچی ہوتی ہی کیا ہے۔ ایک دن یہ محلہ کی بچیوں کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ کہ ان کی کھلائی اُن کو بلا کر لے گئی۔ اور حضرت ابو بکر صدیق نے اُن کا نکاح پڑھ دیا۔ چھوٹی بچّی کو کچھ بھی پتہ نہ لگا۔ کہ کیا ہوا؟ جب اُن کی ماں نے اُن سے کہا۔ کہ اب تو گلیوں میں نہ پھرا کر۔ گھر میں بیٹھا کر۔ تیرا نکاح آنحضرت کے ساتھ ہو گیا ہے۔ تب اُن کو پتہ لگا۔

نکاح تو ہو چکا تھا۔ مگر رخصتی ابھی نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ ابھی تک یہ بہت ہی چھوٹی بچّی تھیں۔ نکاح کے بعد آنحضرت تین برس مکہ میں رہے پھر حضرت ابو بکر صدیق کے ساتھ مدینہ تشریف لے گئے۔ مدینہ پہنچ کر حضرت ابو بکر صدیق نے اپنے اہل و عیال کو مکّہ سے بلوا لیا۔ مدینہ پہنچتے ہی یہ

اتنی سخت بیمار پڑیں۔ کہ سر کے سارے بال جھڑ گئے۔ جب کچھ تندرستی ہوئی۔ اُس وقت اُن کی والدہ نے رخصتی کی رسم ادا کی۔ بہت ہی سادگی کے ساتھ۔ ایک دن حضرت عائشہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ بڑے مزے میں جھولا جھول رہی تھیں۔ کہ ان کی ماں نے آواز دی۔ یہ جھولے سے اُتر کر گئیں۔ تو انہوں نے ان کا منہ ہاتھ دھلایا۔ کپڑے بدلے اور بال درست کر کے دلہن بنا دیا۔ تھوڑی دیر میں آنحضور تشریف لے آئے۔ اور رخصتی ہو گئی۔ اُس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر ۹ برس کی تھی۔

آنحضرتؐ کے مدینہ میں تشریف لاتے ہی لڑائیوں اور جنگوں کا ایسا بے پناہ سلسلہ شروع ہوا۔ جس کی حد نہیں۔ مکہ کے کافر آپ کی جان کے دشمن تھے۔ اور دل سے اس بات کو چاہتے تھے۔ کہ آپ کو اور آپ کے ماننے والوں کو دنیا سے بالکل مٹا دیں۔ اس غرض کے لئے انہوں نے کئی بار مدینہ پر حملہ کیا۔ ان جنگوں کے وقت اگرچہ حضرت عائشہؓ کی عمر کم تھی۔ لیکن وہ بڑی بہادری کے ساتھ جنگ میں شریک ہوئیں۔ اور اپنی بساط سے بڑھ کر خدمت بجا لائیں۔ اُحد کی خطرناک لڑائی میں وہ بے خوف اور نڈر ہو کر میدانِ جنگ میں پھرتیں اور پیاسے سپاہیوں کو پانی پلاتیں۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں۔ اور نہایت شجاعت کے ساتھ برابر فوج کی خدمت کرتی رہیں۔

عائشہؓ نہایت ذہین۔ قابل۔ ہونہار اور لائق عورت تھیں۔ اور رسول اللہؐ کی پاک محبت اور عمدہ تربیت نے اُن کی لیاقت میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ ان کی معاملہ فہمی۔ دور اندیشی اور عقلمندی کی ہر شخص تعریف کرتا تھا۔ انتہا یہ ہے۔ کہ آنحضرتؐ فرماتے ہیں کہ "لوگو! آدھا دین عائشہؓ سے سیکھو"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو اُن کی دنیوی لیاقت اَور دینی خلوص کی وجہ سے اُن سے بیحد اُلفت تھی - اَور وہ آپ کی سب سے چہیتی بیوی مانی جاتی تھیں۔

سنہ ۱۱ھ میں حضور علیہ السّلام کا انتقال ان ہی کے حجرے میں ہوا - اَور اُسی جگہ آپؐ کو دفن کیا گیا - یہ بہت بڑی بزرگی تھی۔ جو خدا تعالیٰ کے فضل سے حضرت عائشہؓ کو حاصل ہوئی - پھر یہ شرف ان کا کیا کم ہے - کہ صدیقؓ اُن کے والد اَور رحمۃ اللعالمینؐ ان کے شوہر تھے۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا انتقال ہوا - اُس وقت حضرت عائشہؓ صدیقہ کی عمر ۱۸ برس کی تھی - انہوں نے زندگی کے باقی دن قران اَور احادیث کی تعلیم اَور خدا تعالیٰ کی عبادت میں گزار دیئے۔ بڑے بڑے اہم اَور مشکل مسئلے صحابہ اُن سے پوچھنے آتے اَور وہ ایسی خوبی اَور عمدگی کے ساتھ اُن کو سمجھا دیتیں - کہ وہ مطمئن ہو کر چلے جاتے - جب صحابہ کے درمیان کسی بڑے مسئلے پر گفتگو ہوتی - اَور کوئی بات طے نہ ہوتی - تو وہ آخری فیصلے کے لیے ان ہی کے پاس آیا کرتے تھے - اَور جو فیصلہ وہ کرتیں - خوشی سے قبول کر لیا کرتے تھے۔

اُس زمانہ کے موافق آپ نے طِبّ کی تعلیم بھی حاصل کی تھی - لوگوں کو کبھی کوئی تکلیف ہو جاتی - تو آپ اُس کا علاج بتلایا کرتی تھیں۔

شعر کے فن سے بھی آپ کو بہت لگاؤ تھا - اَور آپ کو شعرا کے سینکڑوں اشعار حفظ یاد تھے۔

عرب کی تاریخ سے بھی آپ کو بہت اچھی واقفیت تھی۔ علمی حیثیت آپ کی اِس شان کی تھی - کہ سارے صحابہ میں کوئی

شخص لیاقت اور قابلیّت میں اُن سے بڑھا ہوُا نہ تھا۔ صحابہ کو خود آپ کی شان اور عظمت کا اعتراف تھا۔ ایک بزرگ صحابی حضرت ابُو موسیٰ اشعری فرماتے ہیں۔ کہ "ہم کو کبھی کوئی ایسی مشکل پیش نہیں آئی کہ ہم نے عائشہ رضؓ سے پوچھا ہو۔ اور ہمیں اُنہوں نے اس کے متعلق مفید باتیں نہ بتائی ہوں"۔ امام زہری ایک اور بزرگ گزرے ہیں۔ اُن کا قول ہے۔ کہ عائشہؓ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ عالم تھیں۔ بڑے بڑے صحابہ اُن سے مسئلے پوچھا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ رضؓ کے علم کا یہ حال تھا۔ کہ اگر تمام مردوں کا علم ایک جگہ جمع کر دیا جائے۔ تب بھی حضرت عائشہ کا علم اُن سے زیادہ نکلے گا"۔

دین کی سینکڑوں باتیں صرف حضرت عائشہ کی زبان سے لوگوں کو معلوم ہوئیں۔ آنحضرتؐ کے زمانہ کے واقعات وُہ بڑی تفصیل سے لوگوں کو سنایا کرتی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے منہ سے نکلے ہوئے پاک کلمات کو حدیث کہتے ہیں۔ آنحضرتؐ کی ۲۲۱ حدیثیں حضرت عائشہ نے لوگوں سے بیان کی ہیں۔ جو حدیث کی کتابوں میں لکھی ہوئی موجود ہیں۔

علاوہ عالم فاضل ہونے کے حضرت عائشہ رضؓ بڑی فصیح و بلیغ بھی تھیں۔ اور ایسی خوبی اور عمدگی سے مضمون کو ادا کیا کرتی تھیں۔ کہ لوگ سنتے اور عش عش کرنے لگتے۔ تقریر بھی آپ بڑی روانی اور جوش کے ساتھ کر سکتی تھیں۔

علاوہ علمی لیاقت کے اخلاقی حیثیّت سے بھی آپ ہزاروں میں ایک تھیں۔ غیبت کبھی نہیں کرتی تھیں۔ اپنی حالت کو ناپسند کرتی تھیں۔ اپنی حالت پر بالکل قانع رہتی تھیں۔ نہایت خوددار اور غیرت مند تھیں۔ اپنی تعریف کرنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ بڑی بہادر اور نہایت شجاع تھیں۔ سخاوت اور دریادلی اور سیرچشمی میں اپنا

ثانی نہ رکھتی تھیں - ان کی بہن کے بیٹے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں - کہ "میں نے اُن سے زیادہ سخی کسی کو نہیں دیکھا" ایک مرتبہ حضرت امیر معاویہؓ نے اُن کی خدمت میں ایک لاکھ درہم بھیجے وہ سارے انہوں نے ایک دن میں خیرات کر دیئے - اور اپنے لیئے ایک پیسہ بھی باقی نہ رکھا - اُس روز روزہ سے تھیں - لونڈی کہنے لگی - کہ شام کو روزہ کھولنے کے لیے تو اس میں سے کچھ رکھ لیا ہوتا ہنس کر فرمانے لگیں - "پہلے سے کیوں یاد نہ دلایا؟"

جب حضرت عمر خلیفہ ہوئے - تو وہ حضرت عائشہ کا بے حد ادب اور احترام کرتے تھے - آنحضرتؐ کی دوسری بیویوں کے وظیفے تو انہوں نے دس دس ہزار سالانہ مقرر کئے - مگر حضرت عائشہؓ کا وظیفہ بارہ ہزار مقرر فرمایا - لیکن جتنا وظیفہ آتا - آپ اُسے اکثر غریبوں - یتیموں اور بیواؤں میں تقسیم کر دیا کرتی تھیں - جب حضرت عمرؓ کو خبر ہوئی - کہ ساری رقم حضرت عائشہؓ نے خیرات کر دی - تو وہ آتے اور کچھ اور خرچ دے جاتے - اسی وجہ سے حضرت عائشہ فرماتی ہیں - کہ "آنحضرتؐ کے بعد عمر نے میرے ساتھ بڑے بڑے احسانات کئے ہیں"-

مذہبی لحاظ سے بھی آپ نہایت عبادت گزار اور دیندار تھیں - بہت توجہ کے ساتھ نماز پڑھتیں - اور نہ صرف پانچوں وقت کی نمازیں باقاعدگی کے ساتھ ادا فرماتیں - بلکہ راتوں کو اُٹھ کر تہجد کی نماز بھی پڑھتیں - رمضان شریف میں تراویح کی نماز بھی ادا فرماتیں - ہر سال مکہ شریف حج کے لیئے جاتیں - اور اکثر روزے رکھا کرتی تھیں غلاموں کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتیں - اور اکثر غلام خرید کر آزاد کر دیا کرتی تھیں - انہوں نے اپنی زندگی میں ۶۷ غلام آزاد کئے تھے -

۵۸ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ یہ بڑی عجیب اور دلچسپ بات ہے۔ کہ آپ نے اپنی زندگی میں جتنے غلام آزاد کئے۔ آپ کی عمر بھی اتنے ہی سال کی ہوئی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ،

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے تیسرے خلیفہ اور بڑے درجہ کے صحابی ہیں۔ بنی اُمیّہ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور نہایت امیر آدمی تھے۔ اسی لئے عثمان غنی کہلاتے ہیں۔ عثمان اُن خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں۔ جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی زندگی میں جنّتی ہونے کی خوش خبری سنا دی تھی۔ آپ حضرت ابوبکر کے سمجھانے سے شروع ہی میں مسلمان ہو گئے تھے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے آپ کا خاندانی رشتہ یہ تھا۔ کہ آپ کی نانی آنحضرتؐ کے والد کی بہن تھیں۔ اور خود آپ کو اللہ تعالیٰ نے یہ عزّت دی۔ کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی پیاری بیٹی حضرت رقیہؓ کا نکاح آپ سے کر دیا۔ اور جب اُن کی وفات ہو گئی۔ تو حضورؐ نے اپنی دوسری بیٹی حضرت اُم کلثوم کی شادی آپ سے کر دی۔ جب اُن کا بھی انتقال ہو گیا۔ تو حضورؐ نے فرمایا۔ کہ اگر میری تیسری بیٹی بن بیاہی ہوتی۔ تو میں اُسے بھی عثمان سے بیاہ دیتا۔ دیکھو یہ کتنی بڑی بزرگی ہے۔ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہؤا۔ کہ کسی نبی کی دو بیٹیاں ایک شخص سے بیاہی گئی ہوں۔ یہ عزّت صرف حضرت عثمان کے حصّہ میں آئی۔ یہ کتنی عجیب بات ہے۔ کہ آپ کو مسلمان ہونے کے بعد کافروں کے ظلم سے تنگ آ کر دو ہی مرتبہ ہجرت بھی کرنی پڑی۔ پہلی دفعہ حبش کی طرف

دوسری مرتبہ مدینہ کی جانب۔

مسلمان ہونے کے بعد آپ نے اسلام کی بڑی بڑی خدمتیں انجام دیں بہت سے ایسے غلاموں کو اُن کے کافر آقاؤں سے خرید کر آزاد کیا۔ جو اُن کو اسلام قبول کرنے کی وجہ سے بڑی بڑی تکلیفیں دیتے تھے۔ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبِ وحی تھے۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن شریف کی کوئی آیت نازل ہوتی تھی۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن آدمیوں کو بلا کر وہ آیت لکھوا دیا کرتے تھے۔ اُن میں سے حضرت عثمان بھی تھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مدینہ میں تشریف لے آئے۔ تو مسلمانوں کو پینے کے پانی کی بڑی تکلیف تھی۔ سارے شہر میں صرف ایک ہی کنواں میٹھے پانی کا تھا۔ اور وہی ایک یہودی کے قبضہ میں تھا۔ اور وہ یہودی ایسا بُرا آدمی تھا۔ کہ مسلمانوں کو اُس کنویں پر سے پانی نہیں بھرنے دیتا تھا۔ ایک روز آنحضرت نے فرمایا۔ کہ جو مسلمان اس یہودی سے کنواں خرید لے۔ اور سارے مسلمانوں کو اجازت دیدے۔ کہ جو چاہے اُس میں سے پانی بھرے۔ میں اُس شخص کے لئے اس بات کی ضمانت لیتا ہوں۔ کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اُسے جنت میں بڑا درجہ عطا فرمائے گا۔ یہ سنتے ہی حضرت عثمانؓ دوڑے دوڑے گئے۔ اور بیس ہزار روپے میں کنواں یہودی سے خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا۔ جتنی جنگیں اور لڑائیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب کے کافروں سے لڑنی پڑیں۔ سب میں حضرت عثمان آنحضورؐ کے ساتھ رہے جن دو ایک لڑائیوں میں آپ شامل نہیں ہوئے۔ اُن میں خود آنحضرتؐ نے آپ کو مدینہ میں ٹھہرنے کا حکم دیا تھا۔

ایک مرتبہ عجیب قصہ ہوا۔ آنحضورؐ نے خواب دیکھا۔ کہ جیسے وہ اپنے اصحاب سمیت خانہ کعبہ کا حج کر رہے ہیں۔ حضورؐ اپنے خواب کو پورا کرنے کے لئے بہت سے صحابہ کے ساتھ مدینہ سے چل پڑے۔ مکہ کے لوگوں کو خبر ہوئی تو وہ کہنے لگے۔ کہ ہم ہرگز بھی محمدؐ کو اور اس کے ساتھیوں کو حج نہیں کرنے

دیں گے۔ مکہ کے قریب پہنچ کر آنحضرتؐ نے حضرت عثمان کو مکہ والوں کے سمجھانے کے لئے بھیجا۔ کہ ہمارا ارادہ لڑائی بھڑائی کا نہیں۔ ہم تو صرف حج کر کے واپس چلے جائیں گے۔ تم ہمیں نہ روکو۔ اور حج کرنے دو۔

جب حضرت عثمان آنحضورؐ کا یہ پیغام لے کر مکہ کے لوگوں کے پاس گئے۔ تو وہ کہنے لگے۔ کہ عثمان! تم بیشک حج کر لو۔ مگر محمدؐ کو تو ہم ہرگز بھی حج نہیں کرنے دیں گے۔ حضرت عثمانؓ نے جواب دیا۔ کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ کہ آقا تو حج نہ کرے۔ اور غلام حج کرے۔ میں حضورؐ کے بغیر ہرگز حج نہیں کر سکتا۔ اس پر کفارِ مکہ نے ناراض ہو کر حضرت عثمان کو گرفتار کر لیا۔ اس پر اسلامی لشکر میں مشہور ہو گیا کہ عثمان کو قریش نے مار ڈالا۔ حضورؐ کو یہ سن کر نہایت رنج ہوا۔ آپ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اور فرمایا کہ اب تو عثمان کے خون کا بدلہ لے کر یہاں سے جانا ہے۔ اور کون میرے ہاتھ پر مرنے کے لیے بیعت کرتا ہے۔ یہ سنتے ہی فوراً تمام صحابہ نے جن کی تعداد چودہ سو تھی۔ نہایت جوش کے ساتھ آنحضرتؐ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس بیعت پر اللہ تعالیٰ نے بھی خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ اور حضورؐ پر وحی بھیجی۔ کہ "اللہ اُن لوگوں سے راضی ہو گیا۔ جنہوں نے درخت کے نیچے تیرے ہاتھ پر بیعت کی"۔

جب مکے کے لوگوں کو اس بیعت کی خبر ملی۔ تو انہوں نے گھبرا کر جلدی سے حضرت عثمانؓ کو چھوڑ دیا۔ اور وہ حضورؐ کے پاس چلے آئے۔ اس وقت پتہ لگا۔ کہ یہ خبر غلط تھی

ایک لڑائی میں جاتے وقت صحابہ کے پاس سامان جنگ کی بہت کمی تھی۔ فوج کی تعداد اس وقت تیس ہزار تھی۔ آنحضورؐ نے فرمایا۔ کہ جن آدمیوں کو اللہ تعالیٰ نے دے رکھا ہے۔ وہ اس وقت اسلامی فوج کی مدد کریں۔ اس پر حضرت ابو بکرؓ نے اپنے گھر کا سارا مال لا کر حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ حضرت عمرؓ آدھا مال لائے۔ حضرت عثمانؓ نے دس ہزار سپاہیوں کا پورا خرچ برداشت کیا۔ اُن کے لئے گھوڑے فراہم کئے۔ اُن کو تلواریں اور تیر مہیا کئے۔ ہر ایک کو پورا فوجی لباس دیا۔ سب میں زرہیں تقسیم

کیں۔ غرض دس ہزار سپاہیوں کی ضرورت کا ایک ایک تسمہ حضرت عثمانؓ کے روپیہ سے خرید گیا۔ اس کے علاوہ آپ نے ایک ہزار اونٹ اور ستر گھوڑے حضورؐ کی خدمت میں پیش کیئے۔ پھر ایک ہزار دینار لا کر حضورؐ کے دامن میں ڈال دیئے۔ اتنا بے شمار سامان دیکھ کر حضور نے خوش ہو کے فرمایا کہ "یا اللہ! آج کے بعد عثمانؓ کبھی رنجیدہ اور غمگین نہ ہو"۔ کیسے خوش قسمت تھے وہ لوگ جن کو دین کی خدمت کا اس قدر موقع حاصل تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی حضرت عثمانؓ دل کھول کر اپنے روپے سے مسلمانوں کی مدد کرتے رہے ایک مرتبہ مدینہ میں سخت قحط پڑا۔ اور غریبوں کے لیئے بڑی مشکل ہوگئی۔ حضرت عثمانؓ غلہ کے بہت بڑے تاجر تھے۔ اُسی زمانہ میں اُن کے ایک ہزار اونٹ اناج سے بھرے ہوئے باہر سے آئے۔ حضرت عمرؓ خلیفہ تھے۔ انہوں نے حضرت عثمانؓ سے کہا۔ کہ یہ سارا غلّہ حکومت کے ہاتھ بیچ دو۔ ہم اسے غریبوں میں تقسیم کر دیں گے۔ اس کی قیمت کے طور پر انہوں نے بہت سا روپیہ حضرت عثمانؓ کو دینا چاہا۔ مگر انہوں نے نہ لیا۔ اور کہنے لگے کہ "میں تمہارے ہاتھ اپنا غلّہ نہیں بیچ سکتا۔ میں تو یہ غلّہ اُس کے ہاتھ بیچوں گا۔ جو تم سے بہت زیادہ قیمت مجھے دے گا"۔ یہ کہہ کر گھر چلے آئے۔ یہاں پہلے ہی کئی تاجر اُن کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ کہنے لگے کہ ڈیوڑھا منافع لے لو۔ روپیہ کا ڈیڑھ روپیہ ابھی لے لو۔ ہم دیئے دیتے ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا۔ کہ میں اتنے تھوڑے منافع پر تمہارے ہاتھ غلّہ فروخت نہیں کر سکتا۔ تم سب چلے جاؤ۔ اس کے بعد فوراً سارے شہر میں ڈھنڈورا پٹوا دیا۔ کہ عثمانؓ کے ہاں بہت سا غلّہ آیا ہوا ہے۔ جتنے غریب۔ مسکین۔ بیوہ عورتیں اور یتیم بچّے ہیں۔ سب آئیں اور جتنا چاہیں۔ غلّہ مفت لے جائیں۔ لوگ ٹوٹ پڑے۔ اور شام تک ایک دانہ بھی باقی نہ رہا جب رات کو عشاء کی نماز پڑھنے کے لیئے حضرت عثمان مسجد میں گئے۔ تو حضرت عمرؓ سے ہنس کر کہنے لگے۔ دیکھئے آپ مجھے کتنی تھوڑی قیمت دے رہے تھے اور میں نے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ کتنی مہنگی قیمت پر اپنا غلّہ بیچا ہے۔ حضرت عمرؓ فرمانے لگے۔ "ہاں

عثمان تم سچ کہتے ہو۔ میں تم کو بہت تھوڑی قیمت دے رہا تھا۔" حضرت عبداللہ بن عباس ایک صحابی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔ کہ میں نے اُسی رات خواب میں دیکھا۔ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم ایک بہت ہی نورانی لباس پہنے ہوئے ایک گھوڑے پر سوار جا رہے ہیں۔ میں نے دوڑ کر گھوڑے کی رکاب پکڑ لی۔ عرض کی کہ مجھے تو آپ کی زیادت کا بڑا شوق تھا۔ کچھ دیر تو ٹھہریئے۔ آنحضور فرمانے لگے۔ کہ نہیں میں ٹھہر نہیں سکتا۔ کیونکہ عثمان رضؓ نے غلّہ سے بھرے ہوئے ایک ہزار اونٹ غریبوں کے لئے صدقہ کئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے اس صدقہ کو قبول کرلیا ہے اور جنّت میں ایک نہایت خوبصورت دلہن سے عثمان کا نکاح کیا ہے۔ میں اس نکاح میں شامل ہونے کے لئے جا رہا ہوں۔

حضرت عثمانؓ کی سخاوت کا یہ حال تھا۔ کہ مسلمان ہونے کے وقت سے اپنی وفات تک ہر جمعہ کو ایک غلام آزاد کیا کرتے تھے۔ حیا اور شرم۔ آپ کے مزاج میں بیحد تھی۔ نرم مزاج ایسے تھے۔ کہ کبھی غلاموں تک پر ناراض نہیں ہوئے۔ رشتہ داروں کے ساتھ حد سے زیادہ سلوک کرتے رہتے تھے۔ غصہ اور انتقام کا جذبہ آپ میں نام کو بھی نہ تھا۔ نہایت سادگی پسند تھے۔ اپنے آپ معمولی کھانا کھاتے۔ مہمان کے آگے عمدہ سے عمدہ کھانا رکھتے۔ بد کلامی سے بڑی نفرت کرتے تھے۔ بہت ہی حسین اور خوبصورت تھے۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے تحفہ کے طور پر تھوڑا سا گوشت حضرت اُسامہ بن زید کے ہاتھ حضرت رقیہؓ کو بھیجا۔ جو آنحضرتؐ کی بیٹی اور حضرت عثمان کی بیوی تھیں۔ حضرت عثمان بھی اتفاقاً اُس وقت گھر میں تھے۔ اُسامہ کبھی حضرت عثمان کو دیکھتے کبھی حضرت رقیہؓ کو۔ جب واپس گئے۔ تو آنحضورؐ نے پوچھا۔ کہ تم گوشت باہر سے دے کر چلے آئے۔ یا اندر گھر میں چلے گئے تھے۔ انہوں نے عرض کیا۔ کہ نہیں حضورؐ اندر چلا گیا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا۔ کہ کیا عثمان بھی گھر میں تھے؟ اُسامہ نے جواب دیا۔ "جی حضور تھے۔ اس پر آنحضرتؐ نے مسکرا کر فرمایا۔" اُسامہ! کیا تم نے ایسا خوبصورت جوڑا کوئی اور بھی دیکھا ہے؟" اُسامہ کہنے لگے۔ "نہیں حضور۔"

سنہ۲۴ھ میں حضرت عمرؓ کے بعد آپ خلیفہ ہوئے۔ آپ کے زمانہ میں مسلمانوں نے بہت سے ملک فتح کئے۔ اور اسلامی حکومت افریقہ تک پہنچ گئی۔ طرابلس۔ الجزائر مراکش۔ قبرس۔ طبرستان۔ آرمینیہ۔ کابل۔ ہرات۔ سجستان۔ نیشاپور۔ ترکستان اور خراسان سب آپ کے زمانہ میں اسلامی سلطنت میں شامل ہوئے۔ اُس وقت دنیا میں اتنی بڑی اور اتنی وسیع سلطنت اور کوئی نہ تھی۔ آپ کے زمانہ میں مسلمانوں کی فوجی طاقت اس قدر زبردست تھی۔ کہ روم کے شہنشاہ نے جسے قیصر کہتے تھے۔ پانچ سو جنگی جہازوں کے ساتھ اسلامی ملک پر حملہ کیا۔ مگر مسلمانوں نے بُری طرح اُسے شکست دی۔

آپ کے عہد میں اتنی کثرت سے لوگ مسلمان ہوئے۔ کہ مدینہ میں مسجد نبوی کو اور مکہ میں کعبہ شریف کو بہت زیادہ بڑھانے کی ضرورت ہوئی۔ کیونکہ موجودہ جگہ میں نمازی بالکل نہیں سما سکتے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے دونوں مسجدوں کو بہت بڑا کر کے بنوایا۔ اور جمعہ کی نماز کے وقت بجائے ایک دفعہ کے دو مرتبہ اذان دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ ساڑھے تیرہ سو برس ہو گئے۔ آج تک بھی سارے اسلامی ملکوں میں جمعہ کے وقت دو اذانیں ہوتی ہیں۔

اپنے زمانہ خلافت میں ایک بہت بڑا اور اہم کام حضرت عثمانؓ نے یہ کیا۔ کہ صحابہ کے پاس قرآن مجید کی ہزاروں آیتیں اور سورتیں ایسی تھیں۔ جو ٹھیکروں۔ لکڑی کے ٹکڑوں۔ چھوٹے چھوٹے پتھروں۔ بکری کی کھالوں اور درختوں کے پتوں پر لکھی ہوئی تھیں۔ اور ان میں سے بعض کے لکھنے اور نقل کرنے میں لوگوں سے غلطیاں بھی ہو گئی تھیں۔ یا کوئی لفظ چھوٹ گیا تھا۔ آپ نے ایسی سب تحریروں کو ایک جگہ جمع کرنے کا حکم دیا۔ اُس وقت کے لوگ ایسے دیانتدار اور حکم کے بندے تھے۔ کہ فوراً اپنے اپنے گھروں سے ساری تحریریں لاکر آپ کو دیدیں۔ اور کسی ایک شخص نے بھی اُن کو چھپایا نہیں۔ جب اس قسم کی ساری تحریریں اکٹھی ہو گئیں۔ تو حضرت عثمان نے اس خیال سے کہ آئندہ زمانہ میں ان تحریروں کی وجہ سے قرآن کریم میں کوئی اختلاف نہ پڑ جائے۔

اُن سب کو ضائع کر دیا - اُور بڑے بڑے قاریوں - حافظوں اُور قرآن کریم کے عالموں کو پاس بٹھا کر اُس قرآن شریف کی جو اُم المومنین حضرت حفصہ کے گھر میں رکھا تھا - بہت ہی احتیاط کے ساتھ کئی نقلیں کروائیں - اُور اُن کو سارے اسلامی ملکوں میں بھیج دیا - تاکہ وہ وہاں کی جامع مسجدوں میں رکھا رہے - اُور لوگ اس کی تلاوت کیا کریں - اسی وجہ سے آپ کا لقب "جامع القرآن" (یعنی قرآن کو جمع کرنے والا) پڑا - آج دنیا میں جس قدر قرآن موجود ہیں - یہ سب اسی کی ہو بہو نقل ہیں - ایک حرف کی بھی کمی بیشی نہیں اُور قیامت تک اس قرآن میں ذرا سا بھی ردّ و بدل نہیں ہو گا - کیونکہ خدا نے خود فرمایا ہے کہ "ہم اس قرآن کے محافظ اُور نگہبان ہیں"

جب حضرت عثمانؓ کو خلافت کرتے ہوئے بارہ۱۲ سال ہو چکے - تو ۳۵ ہجری میں بعض فسادیوں اُور فتنہ پرداز لوگوں نے آپ کے مکان کی پُشت سے چڑھ کر قرآن شریف پڑھتے ہوئے آپ کو شہید کر دیا - شہادت کے وقت آپ کی عمر ۸۲ سال کی تھی -

---

حضرت علی کرم اللہ وجہ'

حضرت علی کرم اللہ وجہ' ۔ آنحضرتؐ کے چوتھے خلیفہ اور نہایت درجہ بہادر اور شجاع انسان تھے ۔ آپ ابو طالب کے لڑکے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے چچیرے بھائی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر تھے ۔ جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی پیاری بیٹی تھیں ۔ حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ آپ کے بیٹے تھے ۔

حضرت علی کے والد ابو طالب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے چچا تھے ۔ جب آپ پیدا ہوئے ۔ تو اس کے کچھ عرصہ بعد آنحضورؐ نے حضرت علیؓ کو چچا سے مانگ لیا تھا ۔ اس لئے آپ کی تعلیم و تربیت ساری آنحضورؐ ہی کی نگرانی میں ہوئی ۔ حضرت علیؓ کی عمر آٹھ یا نو برس کی تھی ۔ کہ آنحضورؐ صلی اللہ علیہ وسلّم نے خدا تعالیٰ کے حکم کے مطابق نبی ہونے کا دعویٰ کیا حضرت علیؓ سنتے ہی آنحضرتؐ پر ایمان لے آئے ۔ اور جب تک زندہ رہے بڑے جوش اور خلوص کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرتے رہے ۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو تیرہ برس تک کفّار مکّہ کے ہاتھوں سخت سے سخت تکلیفیں اُٹھانے کے بعد نہایت مجبور ہو کر مکّہ چھوڑنا پڑا تو آپ نے حضرت علیؓ سے فرمایا ۔ کہ مکّہ کے بہت سے لوگوں نے اپنا روپیہ پیسہ میرے پاس امانت رکھوایا ہوا ہے ۔ لیکن چونکہ مکّہ والوں نے مل کر اب میرے قتل کا ارادہ کر لیا ہے ۔ اور تلواریں لے کر میرے گھر کے چاروں طرف گھیرا ڈال لیا ہے ۔ اس لئے میں اب یہاں سے جا رہا ہوں ۔ یہ سارا

روپیہ پیسہ تم اپنے پاس رکھو۔ صبح کو جس جس کا روپیہ ہے۔ اُسے واپس کر دینا۔ اَور پھر میرے پاس مدینہ چلے آنا۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے ایسا ہی کیا

دیکھو یہ کتنی عجیب بات ہے۔ کہ اگرچہ کفّار مکّہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے جانی دشمن تھے۔ اَور آپ کو اَور آپ کے تمام ماننے والوں کو بے انتہا تکلیفیں دیتے رہتے تھے۔ مگر جب ضرورت پڑتی تھی۔ تو اپنے مال لا کر حضورؐ ہی کے پاس رکھوایا کرتے تھے۔ اَور سمجھتے تھے۔ کہ ہمارا روپیہ بالکل محفوظ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو کفّار مکّہ نے مدینہ میں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ بار بار خود بھی مدینہ پر حملہ کرتے رہے۔ اَور عرب کی ساری قوموں کو آنحضرتؐ کے خلاف بھڑکا کر اُن سے بھی حملے کرواتے رہے۔ بہت ہی مجبور ہو کر آنحضرتؐ کو بھی لڑنا پڑا۔ جتنی جنگیں آنحضرتؐ کو کافروں کے ساتھ پیش آئیں۔ سب میں حضرت علیؓ آنحضورؐ کے ساتھ رہے۔ اَور ہر معرکہ میں اپنی شجاعت اَور بہادری کے جوہر دکھاتے رہے۔

خیبر ایک مقام تھا۔ جس کا قلعہ بہت مضبوط بنا ہوا تھا۔ اس قلعہ میں یہودی رہتے تھے۔ جن کا کام ہی یہ تھا۔ کہ دن رات مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہیں ۔ اس لئے مجبور ہو کر آنحضورؐ نے قلعہ خیبر پر فوج کشی کی۔ جس وقت آپ خیبر پر پہنچے۔ تو آپ نے دو تین دن بعض بڑے نامور اَور مشہور صحابیوں کو جھنڈا دے کر قلعہ فتح کرنے کے لئے بھیجا۔ مگر ہر آدمی جاتا اَور شام کو واپس لوٹ آتا۔ قلعہ کسی سے بھی فتح نہ ہؤا۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ کہ میں کل صبح ایسے شخص کے ہاتھ میں جھنڈا دوں گا۔ جس کو اللہ تعالیٰ ضرور فتح عطا فرمائے گا ساری رات صحابہ سخت بے چین رہے کہ دیکھیں۔ وہ کون خوش نصیب ہوتا ہے۔ جس کے متعلق حضورؐ نے فرمایا ہے۔ کہ اللہ اس کے ہاتھ پر فتح دے گا

صبح ہوئی تو حضورؐ نے فرمایا۔ کہ علیؓ کہاں ہیں۔ آئیں۔ جھنڈا سنبھالیں اور قلعہ پر حملہ کر دیں۔ حضرت علیؓ کی اُس دن آنکھیں دکھ رہی تھیں انھوں نے عرض کی۔ کہ حضورؐ میں کس طرح حملہ کر سکتا ہوں۔ میری تو آنکھوں میں سخت درد ہو رہا ہے۔ آنکھیں کھلتی بھی نہیں۔ اس پر حضورؐ نے اپنے پاس بلایا۔ اور اپنا لعابِ دہن اُن کی دونوں آنکھوں پر لگا دیا۔ فوراً دونوں آنکھیں کٹوراسی روشن ہوگئیں۔ اور درد جاتا رہا۔

حضرت علیؓ نے خوشی خوشی جھنڈا ہاتھ میں لے لیا۔ اور قلعہ پر حملہ کر دیا۔ یہودیوں نے اگرچہ بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ مگر منہ کی کھائی حضرت علیؓ نے قلعہ کا دروازہ اکھاڑ کر پھینک دیا۔ اور شام سے پہلے پہلے قلعہ فتح ہوگیا۔

ایسے ایسے بہادری اور دلاوری کے کاموں کی وجہ سے آپ کو لوگ اسد اللہ الغالب کہنے لگے۔ اس لفظ کے معنی ہیں "خدائے غالب کا شیر"

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم جنگ تبوک کے لئے ملک شام کی سرحد پر تشریف لے جانے لگے۔ تو آپ نے اپنے پیچھے حضرت علیؓ کو اپنا نائب اور مدینہ کا حاکم مقرر فرمایا۔ حضرت علیؓ اس سے پہلے ساری لڑائیوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ رہے تھے۔ اور خوب خوب دادِ شجاعت دی تھی۔ اس جنگ میں شامل نہ ہو سکنے سے آپ کو بڑا رنج ہوا۔ اور آپ نے آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کی۔ کہ آپ تو جا رہے ہیں۔ اور مجھے عورتوں اور بچّوں میں چھوڑے جا رہے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ کہ تم کو مجھ سے ایسی ہی نسبت ہے جیسی حضرت ہارونؑ کو حضرت موسیٰؑ سے تھی۔ وہ بھی جب توریت لینے کوہ طور پر گئے تھے۔ تو قوم میں حضرت ہارونؑ کو چھوڑ گئے تھے۔

دنیوی لحاظ سے حضرت علیؓ کچھ امیر اور دولتمند نہیں تھے۔ مگر دینی لحاظ سے آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ آپ نہایت عابد۔ زاہد۔ متّقی اور پرہیزگار بزرگ

تھے۔ قرآن مجید کے حافظ اور کلام اللہ کے عاشق تھے۔ عقلمندی۔ دانائی فہم و فراست اور علم و فضل میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ آپ کی رائے ہمیشہ ہی درست اور بہترین ہوا کرتی تھی۔ اس وجہ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے آپ کو اپنے عہدِ خلافت میں تمام سلطنتِ اسلامیہ کا قاضی بنا رکھا تھا۔ اور ہر ایک بات میں آپ سے مشورہ اور صلاح لیتے تھے۔ جب حضرت عمرؓ بیت المقدس کو فتح کرنے کے لئے جانے لگے ہیں۔ تو حضرت علیؓ کو اپنا جانشین بنا گئے تھے۔

جن دنوں حضرت علیؓ قاضی تھے۔ تو اُن کی عدالت میں ایک دفعہ ایک بڑا دلچسپ مقدمہ پیش ہوا۔ واقعہ یہ ہوا۔ کہ دو آدمی ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے روٹیاں کھا رہے تھے۔ ابھی انہوں نے کھانا شروع ہی کیا تھا۔ کہ ایک مسافر آنکلا۔ اور ان دونوں کے ساتھ کھانے میں شریک ہوگیا۔ ان دونوں میں سے ایک کے پاس تین روٹیاں تھیں اور دوسرے کے پاس پانچ تھیں۔ یہ آٹھوں روٹیاں تینوں آدمیوں نے بیٹھ کر کھائیں۔ جب مسافر روٹیاں کھا کر چلنے لگا۔ تو وہ ان دونوں کو آٹھ درم دے گیا۔ اور کہہ گیا۔ کہ میں نے جو روٹیاں کھائی ہیں۔ یہ آٹھ درم اُن کی قیمت کے ہیں۔ آپس میں بانٹ لو۔ اس پر دوسرے شخص نے اپنے پہلے ساتھی سے کہا۔ کہ روٹیاں آٹھ تھیں۔ پانچ میری تین تمہاری۔ درم بھی آٹھ ہیں۔ روٹیوں کی نسبت سے پانچ درم میرے حصہ میں آئے ہیں۔ اور تین تمہارے۔ مگر پہلے آدمی نے کہا۔ کہ نہیں۔ درم نصف نصف تقسیم ہونے چاہئیں۔ دونوں جھگڑنے لگے۔ اور اُن میں سے کوئی بھی اپنا حق چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ یہاں تک کہ مقدمہ حضرت علیؓ کے پاس آیا۔ آپ نے تین روٹیوں کے مالک سے کہا۔ کہ میاں تمہاری

روٹیاں تھوڑی تھیں - جو تین درم تمہیں یہ شخص دے رہا ہے - وہ لے لو - اور چپکے چپکے چلے جاؤ - وہ کہنے لگا - کہ حضرت میں تین درم کیوں لے لوں - انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیجئے - جب سب نے برابر کھایا ہے - تو برابر تقسیم بھی ہونی چاہیئے - آپ نے فرمایا - کہ اچھا! جب انصاف ہی کا سوال ہے - تو پھر تمہارے حصہ میں صرف ایک درم آتا ہے - اور یہی اب تمہیں ملے گا - اس سے زیادہ نہیں - اُس نے بڑی حیرت سے پوچھا کہ "حضرت کس طرح"؟ حضرت علی نے فرمایا "اس طرح" - کہ تمہاری تین روٹیاں تھیں - اور اس کی پانچ - اور کھانے والے تین تھے - چونکہ آٹھ روٹیاں تین آدمیوں میں برابر تقسیم نہیں ہو سکتیں - اس لئے ہر روٹی کے تین تین ٹکڑے سمجھ لو - کل ۲۴ ٹکڑے ہوئے - اب یہ ۲۴ ٹکڑے تین آدمیوں میں برابر تقسیم ہو جاتے ہیں - اور ۸ ٹکڑے ہر شخص کے حصہ میں آتے ہیں - تمہاری تین روٹیاں تھیں - جن کے ۹ عدد ٹکڑے ہوئے - ۸ ٹکڑے تم نے خود کھائے - اور ایک ٹکڑا چھوڑ دیا - اُس مسافر نے ایک ٹکڑا تمہارا لیا - اور ۷ عدد ٹکڑے اس شخص کے لئے اور اپنا پیٹ بھر لیا - کھانے کے بعد اس نے آٹھ درم دیئے - یعنی فی ٹکڑا ایک درم - مسافر نے تمہارا صرف ایک ٹکڑا کھایا - جو تم سے بچ گیا تھا - اس دوسرے شخص کے پاس اپنی پانچ روٹیوں کے ۱۵ ٹکڑے تھے - جن میں سے ۷ ٹکڑے اس نے مسافر کو دیئے - اور ۸ خود کھائے - پس انصاف کی تقسیم یہ ہے کہ چونکہ مسافر نے تمہارا صرف ایک ٹکڑا کھایا - اور اس شخص کے ۷ کھائے اس لئے ایک درم تم لے لو - اور ۷ درم اسے ملیں گے۔

عدالت کے سارے آدمی اس عجیب فیصلے سے حیران رہ گئے - اور ان دونوں شخصوں کو لاجواب ہو کر مجبوراً یہ فیصلہ ماننا پڑا -

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ۳۵ ہجری میں

حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے ۔ اور یہ نے پانچ سال خلافت کرنے پائے تھے کہ ایک پاجی اور خبیث انسان نے جس کا نام عبدالرحمٰن ابن مُلجم تھا۔ آپ کو بے خبری میں اُس وقت خنجر سے شہید کر دیا ۔ جبکہ آپ صبح کی نماز کے لئے گھر سے مسجد میں تشریف لا رہے تھے ۔ آپ کا انتقال ۱۷ ار رمضان ۴۰ ہجری کو ہوا ۔ اور آپ نے ۶۳ سال کی عمر پائی ۔

حضرت بلال رضؓ بن رباح

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ سے مدینہ ہجرت کی تو وہاں پہنچ کر سب سے پہلے مسجد نبوی تعمیر کی۔ اس کی تعمیر میں جملہ صحابہ کرام اور خود آنحضرت بھی شریک تھے۔ جب یہ مسجد تیار ہوئی تو حضرت بلال رضؓ کو حکم دیا گیا کہ اذان دیں۔ حضرت بلال کی آواز نہایت بلند اور کشادہ شیریں تھی آپ کی اذان اس درجہ مؤثر تھی کہ اہل ایمان پر رقت طاری ہو جاتی تھی سوتے مسلمان جاگ اٹھتے تھے اور خدا کی عبادت کیلئے اس کے بلاوے پر دوڑ دوڑ کر چلے آتے تھے۔ حضرت بلال رضؓ حبشی نژاد غلام تھے صورت کے لحاظ سے گو سیہ فام تھے لیکن ان کا دل آئینہ کی طرح صاف و شفاف تھا۔ جن گنے چنے کمزور و ناتواں لوگوں پر اللہ نے اپنا کرم کر کے انکو پہلے اپنے سچے دین پر لگایا تھا۔ آپ اُن میں سے ایک تھے۔ آپ کافروں کے غلام تھے اور اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس لئے آپ پر بے پناہ مظالم توڑے جاتے تھے۔ اور طرح طرح سے آپ کے صبر و استقلال کی آزمائش ہوتی تھی کفار آپکو گرم گرم ریت پر لٹا کر گھسیٹتے اور اس قدر اذیت پہنچاتے کہ آپ بیہوش ہو جاتے۔ پینے کیلئے آپکو گرم ابلا ہوا پانی دیتے۔ لیکن آپکا دل سچے خدا کی راہ پر لگ چکا تھا آپ نے آپنے مذہب کی رسی کو مضبوط پکڑ رکھا تھا آپکے اعتقاد میں کسی قسم کی لرزش نہ ہوئی۔

ابوجہل دشمنِ اسلام آپکو گرم اور تپتی ہوئی چٹانوں پر اوندھا لٹا دیتا۔ آپکی کمر پر بھاری چکی رکھ دیتا اور جب سورج کی گرمی اور پتھروں کی سینک آپکو

بیقرار کر دیتی تو کہتا۔ "بلال اب بھی اپنے خدا سے باز آ"
لیکن دہنِ مبارک سے نکلتا تو صرف اَحَدٌ اَحَدٌ۔ آپکو تڑپتا دیکھکر کفار خوش ہو کر پوچھتے "بولو بلال" تمہارا خدا لات و عزیٰ ہے۔ لیکن آپ کی زبان مبارک سے ہمیشہ احد احد کی صدا نکلتی۔ ایک دن اسی طرح وادیٔ بطحا میں آپ کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس طرف سے گزرے حضرت بلال کا یہ حال دیکھکر آپ تڑپ اُٹھے اور ایک بڑی رقم ادا کر کے آپ کو آزاد کر دیا۔ اس طرح آپ کفار کے پھندے سے رہا ہوئے۔ اور پھر تمام عمر اسلام اور پیغمبرِ اسلام کا ساتھ دیتے رہے۔ حضرت رضی اللہ عنہ کا اخلاق بہت بلند تھا۔ آپ سب سے نرمی اور دوستی کا سلوک کرتے تھے رسول خدا کے عاشق تھے ہر وقت اُن کے ساتھ رہتے چنانچہ جب مکہ فتح ہوا تو آپ حضور کے ہمرکاب تھے۔ آپ ہی کی بزرگ ہستی نے سب سے پہلے مسجد نبوی اور پھر سب سے پہلے خانہ کعبہ میں صدائے تکبیر بلند کی اور مسلمانوں کو فلاح اور اصلاح کی طرف بلایا۔ خدا کی قدرت ہے اسی شخص نے جسپہ لات و عزیٰ کے پرستار ظلم کرتے تھے۔ ان کو کعبہ سے اکھاڑ پھینکا۔ جب حضور پر نور کا وصال ہوا تو آپ کو بیحد صدمہ ہوا اور آپ نے اذان دینی ترک کر دی اور جہاد پر جانے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن خلیفۂ اول نے فرمایا۔ بلال میں تمہیں خدا اور اپنے حق کا واسطہ دے کر کہتا ہوں اس پیری میں مجھے داغِ مفارقت نہ دو چنانچہ آپ جہاد میں شریک ہونے سے باز رہے۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں آپنے جہاد کی اجازت حاصل کر لی اور شامی مہم میں شریک ہو گئے۔ جب فلسطین فتح ہو گیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام کے دورے پر تشریف لیگئے تو بیت المقدس کی سیاحت کیوقت آپ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔
حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ملک شام کی سرسبز اور شاداب زمین پسند آ گئی اور انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے وہاں قیام کرنے کی اجازت لے کر ایک گاؤں

میں رہائش اختیار کی۔ اور حضرت ابوالدرداؓ انصاری کے خاندان سے
جو یہاں پہلے آ کر آباد ہو گیا تھا۔ سلسلۂ مناکحت قائم کیا اور زندگی بسر
کرنے لگے۔ کافی عرصہ کے بعد آپ نے ایک روز حضور اقدسؐ کو خواب
میں دیکھا کہ آپ فرما رہے ہیں بلال یہ خشک زندگی کب تک؟ کیا
تمہارے لئے وہ وقت نہیں آیا کہ ہماری زیارت کرو؟ اس خواب نے
آپ کو گذشتہ زندگی کی یاد دلادی۔ عشق رسولؐ کے پژمردہ پھول پھر
سے ہرے ہو گئے اور آپ مدینہ کیطرف چل پڑے۔ روضۂ اقدس پر
حاضر ہو کر مرغ بسمل کیطرح تڑپنے لگے۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے
اور آپ حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کو چمٹا چمٹا کر پیار کر رہے
تھے۔ ان دونوں کی فرمائش پر آپنے صبح کیوقت مسجد کی چھت پر کھڑے
ہو کر نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ آپ کی آواز سے تمام مدینہ گونج اٹھا۔ ہجرت کے
بیسویں برس اپنے محبوب آقا کی دائمی رفاقت کیلئے دنیا کو آپنے خیرباد
کہا۔ اس وقت آپ کی عمر ساٹھ سال کی تھی۔ آپ دمشق میں
باب الصغیر کے قریب دفن کئے گئے۔

واللہ اعلم بالصواب

حضرت اِمام زینُ العابدین رضؓ

حضرت اِمام زینُ العابدین رضی اللہ عنہ، خاندانِ نبوت کے اُن بزرگوں میں سے ہیں۔ جو اپنے علم وفضل۔ نیکی اور پارسائی میں آفتاب کی طرح روشن تھے اور جن کا نام رہتی دنیا تک بڑی عزّت سے لیا جائے گا۔ آپ حضرت امام حسین علیہ السّلام کے فرزند اور حضرت علی کرم اللہ وجہ کے پوتے ہیں ۳۸ھ ہجری میں پیدا ہوئے۔ اصلی نام علی تھا۔ زینُ العابدین آپ کا لقب ہے۔ آپ کی والدہ شہر بانو یزدجرد شہنشاہ فارس کی بیٹی تھیں۔

جب حضرت امام حسین علیہ السّلام کے ساتھ کربلا کا واقعہ پیش آیا تو آپ اپنے والد کے ہمراہ تھے۔ مگر بیمار ہونے کی وجہ سے لڑائی میں شامل نہیں ہو سکے اور خیمہ میں پڑے رہے۔ دشمنوں نے سارے خاندان کا صفایا کر دیا۔ بچّوں تک کو مار ڈالا امام حسین کی شہادت کے بعد خیمہ میں گھس کر آپ کو بھی قتل کرنے لگے تھے۔ لیکن اُن ہی میں سے ایک شخص کو رحم آگیا۔ اور اُس نے کہا کہ

اس بیمار لڑکے کو جس نے لڑائی میں بھی کوئی حصّہ نہیں لیا۔ مارنے سے کیا فائدہ؟ اس پر ان کو قتل تو نہ کیا گیا۔ مگر قید کر کے یزید کے پاس خاندانِ نبوّت کی عورتوں کے ساتھ دمشق بھیج دیا۔ یزید نے ان کو بھی چھوڑ دیا اور عورتوں کے ساتھ بھی اچھی طرح پیش آیا۔ اِمام زینُ العابدین کو اپنے ساتھ کھانا کھلاتا تھا۔ اور اُن کا بہت لحاظ کرتا تھا۔ کچھ دن کے بعد کہنے لگا کہ چاہے آپ یہاں رہیں چاہے مدینہ چلے جائیں۔ حضرت امام زینُ العابدین نے مدینہ میں جانے کی خواہش کی۔ یزید نے ایک فوج ساتھ کر دی۔ جس نے حفاظت کے ساتھ عورتوں اور حضرت امام کو مدینہ پہنچا دیا۔

حضرت اِمام زینُ العابدین پر ایسی مصیبت پڑی تھی کہ شاید ہی کسی پر پڑی ہو۔ سارا خاندان تباہ ہو گیا۔ مرد کے نام کا بچّہ بھی باقی نہ رہا۔ اس بیکسی اور بے بسی کی وجہ سے حضرت امام کا دل ایسا ٹوٹ گیا کہ تنہائی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ کسی مجلس۔ کسی سوسائٹی۔ کسی سازش میں جب تک زندہ رہے کبھی حصّہ نہیں لیا۔ اگرچہ مختلف موقعوں پر بعض لوگوں نے آپ کو بہت اُبھارا اور اُکسایا مگر آپ نے سختی کے ساتھ ہر ایک کو ڈانٹ دیا۔ اور سب سے الگ تھلگ رہے۔

اس گوشۂ تنہائی میں آپ ہر وقت اللہ کی یاد اور اُس کی عبادت کرتے رہتے تھے۔ جب نماز پڑھنے کے لیئے کھڑے ہوتے تو اللہ تعالیٰ کے حضور میں کھڑا ہونے کے خوف سے کانپنے لگتے۔ جب آندھی چلتی تھی تو اس ڈر سے کہ کہیں یہ اللہ تعالیٰ کا عذاب نہ ہو بیہوش ہو جایا کرتے تھے۔ نماز میں ایسے محو اور بے خبر ہو جاتے کہ چاہے کچھ ہو جائے آپ کو پتہ نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ نماز پڑھ رہے تھے کہ قریب ہی آگ لگ گئی لوگ چیخنے لگے کہ "اے ابنِ رسول اللہ! آگ سے بچئے۔ مگر آپ کو خبر نہ ہوئی اور آپ اُسی طرح اطمینان سے نماز پڑھتے رہے۔ تھوڑی دیر میں آگ بجھ گئی۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوتے تو لوگوں نے پوچھا کہ آگ کی طرف سے آپ کو کس چیز نے بے پروا کر دیا تھا؟ فرمانے لگے دوزخ کی آگ نے۔

بے حد سخی۔ دریا دل اور ہمدرد بزرگ تھے۔ اور بے انتہا دولت خدا کی راہ میں ہمیشہ خرچ کرتے رہتے تھے۔ دو دفعہ اپنے گھر کا آدھا مال غریبوں میں تقسیم کر دیا۔ پچاس پچاس دینار کا لباس اپنے لیئے بنواتے۔ کچھ دن پہنتے۔ پھر اُسے فروخت کر ڈالتے جو قیمت آتی وہ فوراً حاجت مندوں کو دے ڈالتے۔

جب کبھی کوئی سائل مانگنے آتا تو نہایت خوش ہوتے اور ہمیشہ خود اُٹھ کر اُس کی ضرورت پوری کرتے اور فرمایا کرتے تھے کہ خیرات فقیر کے ہاتھ میں جانے سے پہلے خدا کے ہاتھ میں جاتی ہے۔ غلّہ کے بھاری بھاری بوجھ خود اپنی پیٹھ پر لاد کر غریبوں کے گھر پہنچاتے تھے۔ بیسیوں گھرانوں کی خفیہ امداد کرتے تھے۔ جس روز انتقال ہوا۔ مدینہ میں کہرام مچ گیا۔ اُس وقت معلوم ہوا کہ پورے ایک سو گھرانوں کو آپ مستقل طور پر غلّہ اور دوسری ضروریات پہنچایا کرتے تھے۔

مزاج میں تحمل حد سے زیادہ تھا خواہ کوئی شخص آپ کو کتنا ہی بُرا بھلا کہتا کبھی اُلٹ کر جواب نہ دیتے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے آ کر کہا کہ حضور فلاں آدمی آپ کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ آپ نے اُس شخص کو ساتھ لیا۔ اور اُس آدمی کے ہاں تشریف لے گئے اور فرمانے لگے کہ جو باتیں تم نے مجھے کہی ہیں اگر وہ صحیح ہیں تو اللہ تعالیٰ مجھ پر رحم فرمائے اور میری خطاؤں کو بخشے اور اگر وہ باتیں غلط ہیں اور تم نے میرے متعلق جھوٹ کہی ہیں تو اللہ تعالیٰ تمہیں معاف فرمائے۔

عفو اور درگزر کا مادہ آپ میں اتنا تھا کہ سخت سے سخت دشمن سے بھی موقع آنے پر کبھی بدلہ

نہیں لیا۔ اور ہمیشہ معاف کر دیا۔ ہشّام والئ مدینہ آپ کو بہت تکلیف پہنچاتا رہتا تھا لیکن جب معزول ہُوا اور ہر طرف سے لوگوں نے اُسے لعنت ملامت کرنی شروع کی تو آپ نے اپنے فرزند کو منع کر دیا کہ اُس سے کوئی بدلہ نہ لو۔

آپ نرم مزاج اور رحم دل اس قدر تھے کہ جانوروں تک سے بھی سختی سے پیش نہیں آتے تھے۔ نہ کبھی اُن کو مارتے تھے۔

آپ کی خاندانی اور ذاتی بزرگی ایسی تھی کہ مدینہ کا ہر شخص آپ کی بے حد تعظیم کرتا تھا۔ ایک دفعہ حج کے موقع پر خلیفۂ دمشق ہشام بن عبدالملک نے حجر اسود کو چومنا چاہا مگر ہجوم اتنا زیادہ تھا کہ وہ وہاں تک نہ پہنچ سکا اور الگ کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں حضرت امام زینُ العابدین تشریف لائے۔ انہیں دیکھتے ہی لوگ کائی کی طرح چھٹ گئے اور رستہ دے دیا۔ آپ نے اطمینان کے ساتھ حجر اسود کو بوسہ دیا اور واپس تشریف لے گئے۔ خلیفہ یہ نظارہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔

آپ خاندانِ نبوّت سے تعلّق رکھتے تھے۔ اور بنو ہاشم میں اپنے زمانہ میں سب سے افضل مانے جاتے تھے۔ مگر کبھی آپ نے نہ اپنے خاندان پر فخر کیا۔ نہ کبھی غرور کا کوئی کلمہ اپنے مُنہ سے

نکالا۔ مساوات کے آپ اس درجہ حامی تھے کہ اپنی ایک لڑکی کی شادی اپنے ایک غلام سے کر دی۔ اور اپنی ایک لونڈی کو آزاد کر کے اُس سے اپنا نکاح کر لیا۔ لوگوں نے اعتراض کیے مگر آپ نے پروا نہ کی۔

صورت کے لحاظ سے آپ بہت ہی حسین اور خوبصورت واقع ہوئے تھے۔ آپ کا بدن اتنا مصفا تھا کہ اُس سے خوشبو آیا کرتی تھی۔ لباس بھی آپ بہت عمدہ اور نفیس استعمال کیا کرتے تھے۔ مزاج میں بڑی لطافت اور نفاست تھی۔ گندگی کو بالکل برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اور ہمیشہ نہایت صاف ستھرے رہتے تھے۔

۹۴ھ ہجری میں آپ نے مدینہ میں وفات پائی۔ اور حضرت امام حسن علیہ السّلام کے روضہ میں دفن ہوئے۔

حضرت عباس علمبردار رضہ

حضرت ابوالفضل عباس رضہ جو میدان کربلا کے مشہور بہادروں میں سے ہیں - امیرالمومنین حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کے لڑکے اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے سوتیلے بھائی تھے - جب حضرت فاطمہ رضہ کا انتقال ہو گیا - تو حضرت علی رضہ نے اُم البنین بنت حرام ابن خویلہ سے نکاح کیا تھا - جو کہ عرب کے ایک بہت بہادر خاندان سے تعلق رکھتی تھیں - حضرت عباس انہی سے پیدا ہوئے تھے -

حضرت عباس بہت ہی خوبصورت اور حسین و جمیل انسان تھے - اسی لیئے مدینہ میں وہ قمر بنو ہاشم کے لقب سے مشہور تھے - اس لقب کے معنی ہیں " بنو ہاشم کا چاند " جب نوجوان ہوئے تو حضرت شیرِ خدا نے ان کو فنونِ سپہ گری کی نہایت اعلیٰ تعلیم دی - اور وہ جلد ہی شمشیر زنی - تیر افگنی اور نیزہ بازی میں طاق ہو گئے - شجاعت اور دلاوری اُن کو ورثہ میں ملی تھی - ذرا سی تربیت اور مشق کی ضرورت تھی وہ حضرت علی رضہ نے نہایت

حسن و خوبی کے ساتھ بلوری کرادی - اب وہ بہادری
اور شجاعت میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے - نہایت
خوش قد اور بلند قامت تھے - گھوڑے پر سوار
ہوتے تو پاؤں نیچے تک لٹکے رہتے تھے - چہرے
پر تقدس اور پاک باطنی کا نور برستا تھا - بات
چیت - چال ڈھال اور رفتار و گفتار میں اپنے
مقدس اور محترم باپ کی مانند تھے - جب جوان
ہوئے تو ماں باپ نے حضرت زکیہؓ سے آپ
کا نکاح کر دیا - یہ خاتون حضرت عبداللہ کی بیٹی
اور حضرت عبدالمطلب کی پوتی تھیں -

حضرت اِمام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ اگر
چہ حضرت عباس کے سوتیلے بھائی تھے مگر آپ
کو اپنے ان دونوں بھائیوں سے بے انتہا محبت
تھی - اور اسی محبت کا نتیجہ تھا کہ جب اِمام مظلوم
حضرت امام حسین علیہ السّلام پر کربلا کے میدان
میں دشمنوں نے نرغہ کیا تو آپ نے پورے
جوش اور پورے خلوص کے ساتھ اپنے قابلِ
احترام سوتیلے بھائی کی مدد کی - نہ صرف اُن کی
حمایت میں اپنی جان دے دی - بلکہ اپنے تین
سگے بھائیوں کو بھی اپنے سوتیلے بھائی پر قربان
کر دیا - اور دنیا میں برادرانہ محبت کی ایسی یاد
گار قائم کی جو قیامت تک باقی رہے گی - کربلا
کا میدان دنیا کا عجیب و غریب میدانِ جنگ تھا

جس میں ایک طرف نواسۂ رسولؐ حضرت امام حسین علیہ السّلام اپنے ۷۲ کے قریب ساتھیوں کو لیئے کھڑے تھے اور دوسری طرف یزید کی فوج کے دس ہزار سپاہی صفیں باندھے بیکس حسین کو شہید کرنے کے لیئے تلواریں تیز کر رہے تھے۔ اس موقعہ پر اگر حضرت امام حسین چاہتے تو یزید کی بیعت کر کے بڑی آسانی سے اپنی اور اپنے اہل و عیّال اور ساتھیوں کی جانیں بچا سکتے تھے۔ لیکن رسول اللہؐ کے غیوّر اور بہادر اور پاکباز نواسہ نے یہ چاہا کہ ایک فاسق اور فاجر اور ناپاک انسان کی بیعت کر کے دنیا میں ایک بری مثال قائم کرے۔

لہذا اُس محترم اور مقدّس انسان نے بڑی جواں مردی اور دلیری کے ساتھ اپنی جان دے دی مگر آن نہ دی۔

کربلا کی لڑائی میں حضرت امام حسین علیہ السّلام کی فوج کا جھنڈا حضرت عبّاس کے ہاتھ میں تھا۔ اسی لیئے آپ عباس علم دار (یا علمبردار) کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ عَلَم کے معنی عربی زبان میں جھنڈے کے ہیں۔

جس وقت حضرت امام حسینؑ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ میدانِ کربلا میں پہنچے اُس وقت یزید کی طرف سے عُمرِؓ سعد کی فوج نے آپ کا گھیرا

ڈال لیا۔ تاکہ کھانے پینے کی کوئی چیز یہاں تک کہ پانی بھی آپ کے پاس نہ پہنچ سکے۔ جب پانی کی سخت تکلیف ہوئی تو حضرت امام حسینؑ نے عباس سے کہا کہ کسی نہ کسی طرح کچھ پانی دریائے فرات سے جا کر لاؤ۔ اس پر وہ فوراً حکم کی تعمیل میں قریباً تیس آدمیوں کو ساتھ لے کر پانی بھرنے کے لیئے دریائے فرات پر گئے۔ ۲۰ خالی مشکیں ان تیس آدمیوں کے ہمراہ تھیں۔ یہ لوگ پانی لینے کے لیئے جب دریائے فرات پر پہنچے تو وہاں عمرو بن سعد نے پہلے ہی فوج کا ایک دستہ پانی کی حفاظت کے لیئے بٹھا رکھا تھا جس کا سردار عمرو ابن حجاج تھا۔ اُس نے ہر چند اس بات کی کوشش کی کہ یہ لوگ پانی نہ لینے پائیں۔ لیکن حضرت عباسؑ کی بہادری کے سامنے اُس کی کچھ پیش نہ گئی اور حضرت عباس ساری مشکیں بھر کر لے آئے۔ جب عمرو بن سعد کو اس امر کا پتہ لگا تو اُس نے بڑا افسوس کیا اور عمرو ابن حجاج کی امداد کے لیئے چھ ہزار فوج دریائے فرات پر تعینات کر دی اور فوج کو سختی کے ساتھ تاکید کر دی کہ ایک قطرہ بھی پانی کا حسین تک نہ پہنچنے پاتے۔

اب حضرت امام اور اُن کے اصحاب تک پانی کا پہنچنا بظاہر بالکل ناممکن ہو گیا تھا۔ پانی کی

۲۰ مشکیں اتنے آدمیوں کے لیئے کب تک کافی ہوتیں - بہت ہی جلد ساری ختم ہو گیئں -

جب پانی بالکل نہ رہا تو چھوٹے چھوٹے بچّوں نے پیاس کی شدّت کے مارے بلکنا شروع کیا۔ حضرت عبّاس سے اُن کی یہ قابلِ رحم حالت نہ دیکھی گئی - اگرچہ موقع سخت خطرناک تھا۔مگر اُنہوں نے ایک مشکیزہ اُٹھایا - اور گھوڑے پر سوار ہو کر فرات کی جانب چلے - دشمنوں نے یہ دیکھ کر اُن کا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر حضرت عبّاس لوگوں کو قتل کرتے مارتے دھاڑتے کسی نہ کسی طرح فرات تک پہنچ ہی گئے - اور مشکیزہ پانی سے بھر کر گھوڑے پر رکھ لیا - واپسی کے وقت بھی دشمنوں نے سخت مزاحمت کی اور اس بات کی زبردست کوشش کی کہ یہ پانی خیمہ تک نہ پہنچنے پائے - چنانچہ جس ہاتھ سے حضرت عبّاس مشکیزہ تھامے ہوئے تھے - کسی شخص نے پیچھے سے ایک ایسی تلوار اُس ہاتھ پر ماری کہ وہ کٹ کر الگ جا پڑا - حضرت عبّاس نے فوراً دوسرے ہاتھ سے مشکیزہ پکڑ لیا - اور گھوڑے کو سرپٹ دوڑادیا - مگر کسی دوسرے شخص نے حملہ کر کے آپ کا دوسرا ہاتھ بھی تلوار سے اُڑادیا - اس پر آپ نے کمال شجاعت کے ساتھ اپنے دانتوں سے مشکیزہ کو پکڑ لیا - اور

شرعت کے ساتھ خیمہ کی طرف روانہ ہوئے۔ خیمہ کے قریب پہنچ چکے تھے کہ یکایک ایک تیر مشکیزہ میں آ کر لگا۔ مشکیزہ پھٹ گیا۔ اور سارا پانی بہہ گیا۔ اُس وقت بڑی ہی حسرت کے ساتھ حضرت عبّاس نے مشکیزہ کو دیکھا اور چُپ ہو گئے۔ جس پانی کو جان کی بازی لگا کر بڑی مشکل سے حاصل کیا تھا وہ اس طرح اپنی آنکھوں کے سامنے ضائع ہو گیا۔

اِدھر تو پانی ضائع ہُوا اور اُدھر کسی شخص نے حضرت عبّاس کے گھوڑے کے قریب پہنچ کر لوہے کا ایک موٹا سا لٹھ اس زور سے گھما کر آپ کے سر پر مارا کہ سر پھٹ گیا۔ اور آپ شہید ہو گئے۔

دیکھو دنیا میں کیسے کیسے بہادر اور کیسے کیسے شفق ہو گزرے ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق رضؓ

حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہٗ حضرت امام حسین علیہ السلام کی اولاد میں بڑے پایہ کے بزرگ گزرے ہیں۔ جعفر آپ کا نام ہے۔ اور صادق لقب ہے۔ صادق کے معنی نہایت سچے انسان کے ہیں۔ آپ حضرت امام محمد باقر کے لڑکے اور حضرت امام زین العابدین رضؓ کے پوتے ہیں۔ آپ کی والدہ اُم مزدہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہٗ کے پوتے قاسم بن محمدؒ کی لڑکی تھیں۔ یعنی آپ کی ذات میں ہاشمی اور صدیقی دونوں خون ملے ہوئے تھے۔ علمی لحاظ سے حضرت علیؓ کا سارا خاندان چندے آفتاب چندے ماہتاب تھا۔ مگر حضرت امام جعفر صادق کو اپنے علم و فضل کے لحاظ سے بنو ہاشم میں ایک ممتاز درجہ حاصل ہے۔ اُس زمانہ میں قرآن اور حدیث کے جتنے بڑے بڑے عالم تھے سب کا اس امر پر اتفاق ہے کہ امام جعفر صادق علم و عمل۔ زہد و اتقا۔ پرہیز گاری اور پاک بازی میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔ آپ کی بزرگی اور شان اس سے ظاہر ہے۔ کہ حضرت سفیان ثوریؒ۔ حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام ابو حنیفہؒ

جیسے بزرگانِ دین آپ کی شاگردی پر فخر کرتے تھے۔
علم وفضل کے علاوہ اخلاق و عادات کے لحاظ سے بھی آپ ایک نہایت بے نظیر انسان تھے۔ ہر ادنیٰ و اعلیٰ سے مروّت اور خوش اخلاقی سے ملتے۔ کبھی کسی کے متعلق بدظنی سے کام نہ لیتے۔ جہاں تک ہو سکتا غریبوں کی مدد کرتے۔ یتیموں اور بیواؤں کی خفیہ اعانت کرتے۔ بُرائی کا بدلہ کبھی بُرائی سے نہ لیتے نہایت سخی اور سیر چشم تھے۔ عبادتِ الٰہی آپ کی زندگی کا ایک جزو بن گئی تھی۔ دن اور رات کا کوئی وقت عبادت اور ذکرِ الٰہی سے خالی نہ ہوتا تھا۔ حضرت امام مالک رضؓ فرماتے ہیں کہ میں مدّت تک حضرت امام جعفر صادق کی خدمت میں روزانہ جاتا رہا۔ لیکن جب بھی گیا۔ کبھی تو آپ کو نماز پڑھتے ہوئے پایا۔ کبھی قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے دیکھا۔ اور کبھی اس حال میں آپ ملے کہ روزہ سے تھے۔ آپ کی سخاوت اور دریا دلی کا یہ حال تھا کہ کھانا کھانے بیٹھے ہیں۔ اور کوئی سائل دروازہ پر آگیا تو آپ نے گھر کا سارا کھانا سائل کو دے دیا اور آپ اور آپ کے گھر والے بھوکے سو رہے۔ مذہبی لڑائی جھگڑوں کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ اور اُن سے بچنے کی لوگوں کو بار بار ہدایت کرتے رہتے تھے نہایت تنہائی پسند تھے۔ اور بڑی خاموش زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر اس کے باوجود نہایت دلیر

اور بہادر شخص تھے۔ نہ کبھی کسی سے مرعوب ہوتے نہ حق بات کہنے میں کسی بڑے چھوٹے کا لحاظ کرتے خاندان عبّاسیہ کا خلیفہ منصُور آپ کی بہت تعظیم کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اُس نے آپ کو دربار میں بُلایا اور بہت ادب سے پیش آیا۔ آپ اُس کے دربار میں بیٹھے تھے۔ تمام امیر اور وزیر بھی موجود تھے۔ کہ ایک مکھّی خلیفہ کے ماتھے پر آ بیٹھی۔ منصور نے ہاتھ سے اُسے اُڑا دیا۔ وہ پھر آ بیٹھی۔ اُس نے پھر اُڑا دیا جب تین چار مرتبہ ایسا ہُوا اور مکھی بار بار آ کر بیٹھتی رہی۔ تو منصُور کو غصّہ آ گیا اور اُس نے حضرت امام جعفر صادق سے پوچھا کہ "یا حضرت! یہ تو بتایئے کہ مکھّی کو اللہ تعالیٰ نے کیوں پیدا کیا"؟ حضرتِ جعفر صادق رضہ نے فوراً جواب دیا کہ "مغروروں کا غرور توڑنے کے لیئے"۔ یہ معقول جواب سُن کر منصُور چپ رہ گیا۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ شریف آدمی کو تین چار باتوں کے کرنے میں کبھی کوئی شرم نہیں کرنی چاہیئے۔ ایک تو اپنے والد کی تعظیم کرنے میں۔ دوسرے مہمان کی خدمت کرتے ہیں۔ تیسرے اپنے اُستاد کا ادب کرنے میں۔ آپ بڑی تاکید سے لوگوں کو اس بات کی تلقین کرتے رہتے تھے کہ کبھی کسی پر بدظنی نہ کرو۔ جب کسی شخص میں کوئی بُرائی یا عیب کی بات دیکھو تو اُس کی نرم اور اچھی تاویل کرو ایک مرتبہ نہیں بلکہ ستّر دفعہ

اور بہادر شخص تھے۔ نہ کبھی کسی سے مرعوب ہوتے نہ حق بات کہنے میں کسی بڑے چھوٹے کا لحاظ کرتے خاندان عبّاسیہ کا خلیفہ منصور آپ کی بہت تعظیم کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اُس نے آپ کو دربار میں بُلایا اور بہت ادب سے پیش آیا۔ آپ اُس کے دربار میں بیٹھے تھے۔ تمام امیر اور وزیر بھی موجود تھے۔ کہ ایک مکّھی خلیفہ کے ماتھے پر آ بیٹھی۔ منصور نے ہاتھ سے اُسے اُڑا دیا۔ وہ پھر آ بیٹھی۔ اُس نے پھر اُڑا دیا جب تین چار مرتبہ ایسا ہُوا اور مکھی بار بار آ کر بیٹھتی رہی۔ تو منصور کو غصّہ آگیا اور اُس نے حضرت امام جعفر صادق سے پوچھا کہ "یا حضرت! یہ تو بتایئے کہ مکھی کو اللہ تعالیٰ نے کیوں پیدا کیا"؟ حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فوراً جواب دیا کہ "مغروروں کا غرور توڑنے کے لیئے"۔ یہ معقول جواب سُن کر منصور چپ رہ گیا۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ شریف آدمی کو تین چار باتوں کے کرنے میں کبھی کوئی شرم نہیں کرنی چاہیئے۔ ایک تو اپنے والد کی تعظیم کرتے میں۔ دوسرے مہمان کی خدمت کرتے ہیں۔ تیسرے اپنے اُستاد کا ادب کرتے میں۔ آپ بڑی تاکید سے لوگوں کو اس بات کی تلقین کرتے رہتے تھے کہ کبھی کسی پر بدظنی نہ کرو۔ جب کسی شخص میں کوئی بُرائی یا عیب کی بات دیکھو تو اُس کی نرم اور اچھی تاویل کرو ایک مرتبہ نہیں بلکہ ستّر مرتبہ

اس کے بعد بھی تم کو اُس میں کوئی خوبی نہ ملے تو پھر خود اپنے آپ کو ملامت کرو"۔ ایک دفعہ آپ نے ایک بڑی عجیب اور لطیف بات کہی، فرمانے لگے کہ دنیا کا بھی عجب حال ہے جب کسی انسان کے موافق ہوتی ہے تو دوسروں کی خوبیاں چھین کر اس کو دے دیتی ہے۔ اور جب اُسی شخص سے ناراض ہوتی ہے تو پھر خود اُس کی خوبیاں دوسروں کے حوالے کر دیتی ہے۔ پس دنیا کی برائی بھلائی کا آدمی بالکل خیال نہ کرے بلکہ ہمیشہ اپنی نظر خدا پر رکھے۔ اور ہر کام میں اُسی پر بھروسہ کرے۔

حضرت امام جعفر صادق کا قاعدہ تھا کہ عمدہ اور قیمتی لباس پہنا کرتے تھے۔ اور نہایت پاکیزہ طبیعت اور صفائی پسند بزرگ تھے۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے آپ کے قیمتی لباس پر اعتراض کیا۔ اور کہا اللہ والوں کے لیئے ایسا لباس پہننا ٹھیک نہیں، نہ آپ کے بزرگوں کا لباس ایسا تھا۔ ایسے کپڑے تو کچھ ہم جیسے دنیا داروں ہی کو زیب دیتے ہیں۔ حضرت امام فرمانے لگے کہ پہلے بہت تنگی اور مفلسی کا زمانہ تھا۔ نہ کپڑا ملتا تھا۔ نہ پیسہ پاس ہوتا تھا۔ اس لیئے ہمارے بزرگ موٹا جھوٹا لباس پہن کر گزارہ کر لیا کرتے تھے لیکن اس زمانہ میں دولت کا دریا بہہ رہا ہے۔

اس لیئے اگر ہم اچھا لباس پہنیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے ۔ اور اس کے علاوہ ایک بات یہ ہے کہ یہ لباس بھی ہم نے تم جیسے دنیا داروں کے لیئے پہنا ہے ۔ خدا کے لیئے جو لباس ہے وہ اس کے اندر ہے ۔ یہ فرما کر آپ نے اپنی قمیص اُٹھائی تو اندر ٹاٹ کا کرتہ جسم پر تھا ۔ فرمانے لگے کہ خدا کی نظر باطن پر ہے اس لیئے اندرونی طور پر یہ ٹاٹ کا لباس پہنا ہے ۔ تم لوگ جو دنیا پرست ہو ظاہر کو دیکھتے ہو تمہارے لیئے اوپر کا لباس ہے ۔

آپ ۸۰ھ ہجری میں مدینہ شریف میں پیدا ہوئے اور ۶۸ سال کی عمر پا کر ۱۴۸ھ ہجری میں وفات پائی ۔

حضرت امام محمدؒ باقرؒ

حضرت امام باقر رضی اللہ عنہٗ بہت صاحبِ علم ۔ متقی ۔ پرہیزگار اور بے حد نیک بزرگ تھے ۔ ہر وقت خدا اور رسول کا ذکر کرتے رہتے تھے ۔ دن رات میں ڈیڑھ سو رکعتیں نماز پڑھتے ۔ اور اپنا سارا وقت نیک کاموں میں خرچ کرتے تھے ۔ آپ کے دو ہی کام تھے ۔ یا تو لوگوں کو قرآن اور حدیث کی تعلیم دیتے رہتے تھے ۔ یا خدا کی عبادت میں مشغول رہتے تھے ۔ آپ کا نام میر محمدؐ تھا ۔ مگر آپ باقر کے لقب سے مشہور ہیں ۔ باقر عربی زبان میں پھاڑنے والے کو کہتے ہیں ۔ مطلب یہ ہے ۔ کہ آپ علم و فضل کو پھاڑ کر اُس کے اندر داخل ہو گئے تھے ۔ اور علم کے جس قدر اسرار ہیں ۔ اُس سے آپ بخوبی واقف تھے اس صورت میں باقر کے معنی نہایت وسیع علم والے آدمی کے ہوئے ۔

خاندانی لحاظ سے آپ کی بزرگی کا کون شخص اندازہ لگا سکتا ہے ۔ حضرت امام زین العابدین آپ کے والد تھے ۔ جو علم کا ایک سمندر مانے جاتے تھے ۔ حضرت امام حسین علیہ السلام آپ کے دادا تھے ۔ جن کی شجاعت اور بزرگی آفتاب کی طرح روشن ہے حضرت امام حسن علیہ السلام آپ کے نانا تھے ۔ جن کی بیٹی اُم عبداللہ آپ کی والدہ تھیں ۔

آپ ۵۷ ہجری میں پیدا ہوئے ۔ یعنی آپ کے دادا حضرت

امام حسین علیہ السّلام کربلا کے میدان میں مظلوم شہید ہوئے اُس وقت آپ کی عمر تین برس کی تھی ۔ نہایت فاضلِ اجل باپ کی گود میں پل کر بڑے ہوئے ۔ تو حضرت انس بن مالک ۔ سعید بن میدب عبداللہ بن ابی رافع ۔ حرملہ اور عطاء بن سیار جیسے زبردست عالموں سے قرآن اور حدیث اور مختلف علوم کا سبق لیا ۔ اور بہت ہی جلد علم و فضل میں طاق ہو گئے ۔ آپ کی بزرگی اور علمی فضیلت اس بات سے ظاہر ہے ۔ کہ امام اوزاعی ۔ اعمش ۔ اور امام زہری وغیرہ بہت سے بزرگ جو اپنے زمانہ میں بڑے عالم اور نہایت فاضل سمجھے جاتے تھے ۔ آپ کے شاگرد تھے ۔

۱۱۴ ہجری میں آپ کی وفات ہوئی ۔ اور آپ کو مدینہ شریف کے قبرستان میں جس کا نام جنّت البقیع ہے ۔ اپنے نانا کے مزار کے پاس دفن کیا گیا ۔

خالد بن ولید

آپ قریش کے ایک معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کا خاندان شروع سے سپہ سالاری اور فوج کے انتظام کے لئے ممتاز سمجھا جاتا تھا۔ جنگ اُحد کے موقع پر ابھی آپ نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ اور آپ قریش مکہ کی طرف سے اس لڑائی میں شریک تھے۔ جب مسلمانوں نے زور کا حملہ کیا۔ اور قریش مکہ کے پاؤں اُکھڑے تو آپ بڑی بہادری اور دلیری سے ڈٹے رہے۔ آپ ہی کی وجہ سے فوج کے پاؤں پھر جم گئے۔ غرضیکہ مکہ والوں نے جتنی لڑائیاں مسلمانوں کے خلاف کیں۔ ان سب میں آپ نے نمایاں حصہ لیا۔

۸ھ میں آپ اور حضرت عمرو بن العاص دونو ایک ساتھ مدینہ پہنچے۔ اور رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہو کر ایمان لائے۔ جنہیں دیکھ کر آنحضرتؐ نے فرمایا۔ "مکہ نے اپنے جگر کے ٹکڑے تمہاری طرف پھینک دیئے ہیں۔" اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت خالد مدینہ ہی میں رہے۔ رسولِ خداؐ نے آپ کا خاندانی اعزاز برقرار رکھا۔ آپ سے فتوحاتِ اسلامی میں بڑی مدد ملی۔

سب سے پہلے جنگ موتہ میں آپ نے اپنی بہادری اور حکمت عملی کے جوہر دکھائے۔ جنگ موتہ کا واقعہ اس طرح سے ہے۔ کہ رسولِ خدا نے حارث بن عمیر کو خط دے کر بصریٰ کے حاکم کے پاس بھیجا۔ تو شرجیل بن عمرؓ نے انہیں شہید کر دیا۔ چنانچہ اس کے انتقام کے لیے رسولِ خداؐ

نے ۸ھ میں لشکر کشی کی۔ اور جنگ موتہ کا واقعہ پیش آیا۔ اس لڑائی میں زید بن حارث، حضرت جعفر طیار، عبداللہ بن رواحہ جو بڑے رتبہ کے صحابی تھے۔ شہید ہو گئے۔ آخر میں حضرت خالد نے جھنڈا سنبھالا۔ آپ نے ایسی بہادری اور دانشمندی سے کام لیا۔ کہ مسلمانوں کی تمام فوج صحیح سلامت نکل آئی۔ اس لڑائی میں ان کے ہاتھ سے نو تلواریں ٹوٹیں۔ چنانچہ رسولِ خدا نے ان کی اس بہادری کی وجہ سے سیف اللہ کا لقب عطا فرمایا۔

فتح مکہ کے دن بھی آپ فوج کے ایک دستہ کے سردار تھے جس رستہ سے یہ دستہ مکہ میں داخل ہوا۔ وہاں مکہ کے کچھ نوجوانوں نے مقابلہ کیا۔ مگر آپ نے انہیں شکست دے کر میدان سے بھگا دیا۔ فتح مکہ کے بعد ہوازن کی لڑائی پیش آئی۔ جو جنگِ حنین کے نام سے مشہور ہے اس لڑائی میں بھی آپ سب سے پہلے حملہ کرنے والی فوج کے سردار تھے۔ اس لڑائی کے موقع پر آپ کے جسم پر کئی زخم آئے۔ رسولِ خدا آپ کو دیکھنے کے لئے تشریف لے گئے۔ زخموں پر دم کیا۔ چنانچہ وہ بہت جلد اچھے ہو گئے۔

حضرت ابوبکرؓ کے خلافت کے زمانہ میں عرب میں کئی ایک جھوٹے نبی پیدا ہو گئے۔ ان کی سرکوبی کے لئے حضرت خالد کی سپہ سالاری میں فوجیں بھیجی گئیں۔ چنانچہ آپ نے تمام جھوٹے نبیوں کو ختم کر دیا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں بے دینی کی جگہ اسلام اور بغاوت کی جگہ امن قائم کر دیا۔

عراق میں بسنے والے عربی قبیلہ ایل کو اہل عراق نے ستانا شروع کر دیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد آخر انہوں نے فیصلہ کیا۔ کہ اسلام قبول کر کے مسلمانوں سے مدد لیں۔ چنانچہ ان کا سردار مثنیٰ شیبانی اپنی قوم کو

ساتھ لے کر حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ اور مسلمان ہونے کے بعد اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے مثنیٰ کو جہاد کی اجازت دیدی۔ اور ان کی امداد کے لئے حضرت خالد کی سرداری میں فوج بھیجی۔ خالد نے عراق کے تمام سرحدی مقامات فتح کر لئے۔ اور حیرہ پر علم فتح نصب کیا۔ عراق کی یہ فتوحات خالد کے بڑے بڑے کارناموں پر مشتمل ہیں۔ انہی ایام میں ادھر شام کی مہم درپیش تھی۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے خالد کو حکم بھیجا کہ فوراً شام کو روانہ ہوں۔ جونہی خالد ادھر روانہ ہوئے۔ عراق کی فتوحات رُک گئیں۔

شام پر ان دنوں رومیوں کی حکومت تھی۔ جو عیسائی مذہب رکھتے تھے۔ عیسائیوں نے بڑے زور شور سے لڑنے کی تیاریاں کی تھیں۔ مگر حضرت خالد نے ان کے خوب دانت کھٹے کئے۔ آپ راستہ میں چھوٹے چھوٹے شہر فتح کرتے ہوئے اپنی فوج لے کر دمشق پہنچے۔ یہاں تین ماہ تک محاصرہ رہا۔ عیسائی مسلمانوں کا استقلال دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ اور ہرقل قیصر روم کی امدادی فوج کا انتظار کرنے لگے۔ مگر حضرت خالد کی حکمت عملی یہاں بھی کام آئی۔ آپ نے ذوالکلاع کو کچھ فوج دے کر دمشق سے ایک منزل کے فاصلے پر متعین کر دیا تھا۔ جس نے ہرقل کے لشکر سے جنگ کر کے انہیں شکست دی۔ گو دمشق والوں کو اس طرح مایوسی ہوئی۔ مگر انہیں اپنے قلعے کی مضبوطی پر بہت بھروسہ تھا۔ اسی اثنا میں ایک دن دمشق کے بڑے پادری کے گھر لڑکا پیدا ہوا۔ تمام لوگ اس خوشی میں مشغول شراب کے نشہ میں بدمست تھے۔ آپ رات کو کم سویا کرتے تھے۔ اور ذرا ذرا سی بات کی خبر رکھتے تھے۔ اسی وقت اُٹھے۔ اور چند بہادر افسروں کو ساتھ لے کر کمند کے ذریعے دیوار پر چڑھ گئے۔ دیوار سے نیچے اُتر کر آپ نے پہلے دربانوں کو ہمیشہ کی نیند سلایا۔ پھر قفل توڑ

کر دروازے کھول دیئے۔ دروازوں کے کھلتے ہی اسلامی فوج سیلاب کی طرح اندر گھس آئی۔ اگرچہ شہر لڑ کر فتح کیا تھا۔ مگر ابوعبیدہ نے چونکہ صلح منظور کر لی تھی۔ اس لئے مسلمانوں نے نہ کسی کو لونڈی غلام بنایا۔ اور نہ غنیمت کی اجازت دی گئی۔

دمشق کی شکست سے رومیوں کو بڑی غیرت آئی۔ اور انہوں نے چاروں طرف سے جمع ہو کر فحل کے مقام پر مسلمانوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ادھر حضرت خالد نے بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا۔ تین گھنٹہ تک بڑی گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی۔ آخر میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ اور انہوں نے حضرت عمر کی ہدایات کے مطابق رعایا کو ذمی قرار دے کر ان کے جان و مال اور گرجاؤں وغیرہ کی حفاظت کی۔ اس کے بعد رومیوں نے اپنی قوت حمص میں جمع کی۔ جو شام کے اضلاع میں سے ایک بڑا ضلع اور قدیم شہر ہے مگر حضرت خالد اور دوسرے مسلمان سپہ سالاروں کی دلیری کی وجہ سے اس شہر پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ عیسائیوں نے مسلمانوں کی روزانہ پیشقدمی کو دیکھتے۔ اور دمشق وحمص میں شکستیں کھاتے ہوئے یرموک کی جنگ کے لئے پورے زور شور سے تیاری کی۔ ادھر حضرت خالدؓ نے لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ رومی فوجوں کے سپہ سالار نے ابتدا میں یہ کوشش کی کہ اگر مسلمان کچھ رقم لے کر راضی ہو جائیں۔ تو لڑائی سر سے ٹل جائے۔ مگر خالد نے جواب دیا۔ کہ ہم صرف اللہ کا دین پھیلانے کے لئے ایسا کر رہے ہیں۔ یا تم اسلام قبول کرو۔ ورنہ جزیہ دو۔ اگر دونوں باتیں نامنظور ہوں۔ تو تلوار ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کر دے گی۔" اس دو ٹوک جواب سے رومی افسران میں جوش پیدا ہو گیا۔ انہوں نے دو لاکھ فوج اس جوش اور سروسامان سے میدان جنگ میں نکالی۔ کہ مسلمانوں کو بھی حیرت ہوئی۔ مگر حضرت خالدؓ ذرا نہ گھبرائے۔ اور

آپ نے عرب کے قاعدے کے خلاف اسلامی فوج کی نئے طور پر صف آرائی کی۔ آخر مسلمانوں نے ایسی بے جگری سے لگاتار حملے کئے۔ کہ رومیوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور ان کا سپہ سالار ہامان جان بچا کر بھاگ گیا۔ اس جنگ میں خالد نے اتنا کام کیا۔ کہ لڑتے لڑتے ان کی سات تلواریں ٹوٹیں۔ اور دشمنوں پر ان کی ایسی دھاک بیٹھی۔ کہ پھر ان کو اسلامی فوج کے مقابلے کی ہمّت نہ پڑی۔

سنہ ۱۷ھ میں حضرت خالدؓ کو حضرت عمرؓ نے سپہ سالاری کے عہدے سے معزول کر دیا۔ حضرت خالد نے نہایت خوشی سے اپنی معزولی کا حکم سنا۔ اور سپہ سالار سے سپاہی بن گئے۔ کیونکہ ان کے نزدیک اصل مقصد کام تھا نہ کہ نام وہ جس طریقے سے بھی ہو۔ اسلام کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ اس معزولی کے بعد خالد مدینہ آئے۔ اور حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا۔ کہ "عمر خدا کی قسم تم میرے معاملہ میں ناانصافی کرتے ہو۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ "خالد میں نے تمہیں ناراضی یا خیانت کی بنا پر موقوف نہیں کیا۔ لیکن میں یہ دیکھتا تھا۔ کہ لوگ تم پر فریفتہ ہوتے جاتے ہیں۔ اس لئے میں نے تمہیں معزول کر کے مسلمانوں پر یہ ثابت کر دیا۔ کہ اسلامی فتوحات کا دارومدار خالد ہی کے قوتِ بازو پر نہیں ہے۔ ویسے خدا کی قسم! مجھے تم سے اتنی ہی محبّت ہے۔ اور میرے دل میں تمہارے لئے وہی عزّت موجود ہے"۔

آخر عمر میں حضرت خالد نے گوشہ نشینی اختیار کی۔ اور سنہ ۲۲ھ میں ۸۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔

اسلام کے اس سب سے بڑے اور جانباز سپاہی کا مزار شام کے مشہور شہر حمص میں ہے۔ جہاں ہر وقت زائرین کا جمگھٹا رہتا ہے

حضرت زید بن حارث

آپ کا تعلق یمن کے ایک معزز قبیلے سے تھا۔ بچپن میں آپ
کو ڈاکو اٹھا کر لے گئے۔ اور غلام بنا کر مکہ میں بیچ دیا۔

حکم بن حزام نے آپ کو چار سو روپے میں خرید کر اپنی پھوپھی
حضرت خدیجۃ الکبریٰ کو دے دیا۔ چونکہ آپ کے مقدر کا ستارہ درخشاں
تھا۔ اس لئے حضرت خدیجہؓ نے آپ کو رسولِ خدا کی خدمت میں پیش کر دیا

آپ کے باپ کو اپنے بیٹے کے گم ہونے کا بہت غم تھا۔ آپ کی
جدائی میں ان کی آنکھیں بے نور ہو گئی تھیں۔ کچھ عرصہ بعد حاجیوں کے
کے ذریعے جب حارث کو آپ کا پتہ ملا۔ تو یہ خوشخبری سنتے ہی ان کی
آنکھیں دوبارہ روشن ہو گئیں۔ اور وہ اپنے بھائی کو ساتھ لے کر رسولِ خدا
کی خدمت میں پہنچے۔ اور آنحضرت صلعم سے درخواست کی۔ کہ میرے
بیٹے کو گھر جانے کی اجازت دی جائے۔ رسولِ خدا کا قلب شفیق کب یہ
برداشت کر سکتا تھا۔ کہ بیٹے کو باپ سے چھین کر اپنے پاس رکھیں مگر
محبت اور رحمت کا یہ بھی تقاضا تھا۔ کہ اس کو زبردستی اپنے سے الگ
نہ کیا جائے۔ غرض آپ کے باپ کو کہا۔ کہ اگر زید تمہارے ساتھ جانا
چاہے۔ تو میں اس کو نہیں روکتا۔ باپ خوش ہوا۔ کہ اور کیا چاہیئے
مگر اسے معلوم نہ تھا۔ کہ رسولِ خدا کی شفقت مہر پدری سے کہیں بڑھ کر
ہے۔ رسولِ خداؐ نے آپ کو بلا کر صورتِ حالات سے آگاہ کر دیا اور فرمایا

کہ تم بالکل آزاد ہو۔ چاہے میرے پاس رہو یا اپنے باپ کے ساتھ چلے جاؤ۔ مگر آپ نے اپنے باپ کے ساتھ جانا پسند نہ کیا۔ اور رسولِ خدا کی خدمت میں رہنے کو ترجیح دی۔ کیونکہ آپ کو رسولِ خدا سے بے انتہا محبت تھی۔ اور آنحضرت صلعم بھی آپ پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ اسی دن آنحضرت صلعم نے اعلان فرمایا۔ کہ آج سے زید میرا بیٹا ہے۔ میں اس کا وارث ہونگا اور وہ میرا وارث ہوگا۔ جس شخص کو ایسی سعادت نصیب ہو۔ وہ رسولِ خدا کے آستانہ مبارک کو کیسے چھوڑ سکتا ہے۔

اللہ تعالےٰ کی طرف سے جب آنحضرت صلعم کو منصبِ نبوت عطا ہوا۔ اور آپ نے دعوتِ اسلام دی۔ تو سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ ایمان لائیں۔ اور لڑکوں میں رسولِ خدا کے چچا زاد بھائی حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ جن کی عمر اس وقت صرف آٹھ سال کے قریب تھی۔ اور مردوں میں سے حضرت ابوبکر صدیق اس کے بعد چوتھا نمبر حضرت زید کا ہے۔ غلاموں میں سے اسلام قبول کرنے میں آپ کا نمبر اوّل ہے۔ اسلام کی خاطر آپ نے ہر طرح کی تکلیفیں برداشت کیں۔ مگر اُف تک نہ کی۔

بعثت پر دسواں سال جا رہا تھا۔ مکّہ والوں کی سخت دلی دیکھ کر رسولِ خدا نے طائف کا رُخ کیا۔ اس سفر میں آپ آنحضرتؐ کے ہمراہ تھے۔ اس واقعہ سے اس قلبی تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔ جو آپ کے اور رسولِ خداؐ کے درمیان تھا۔ طائف میں بھی آپ کو قسم قسم کی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں۔ آنحضرت صلعم سب سے پہلے وہاں کے سب سے بڑے خاندان کے تین معزز بھائیوں کے پاس گئے۔ مگر ان تینوں نے رسولِ خدا کے ارشادات کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ وہاں دس دن قیام رہا۔ اور یکے بعد دیگرے وہاں کے لوگوں کو دعوتِ اسلام دی

گئی۔ مگر دنیا پرست کہاں خیال کر سکتے تھے۔ ہر طرف سے یہی جواب ملتا تھا۔ کہ اگر سچے ہو۔ تو پہلے اپنی قوم کو راہ راست پر لاؤ۔ غرض سخت قسم کی اذیتیں اُٹھانے کے بعد آپ رسولِ خدا کے ہمراہ واپس مکہ آئے۔

آپ مکہ میں تیرہ سال تک اپنے پیارے آقا کے ساتھ اسلام کی تبلیغ میں مصروف رہے۔ آنحضرت صلعم نے آپ کی پہلی شادی حضرت اُم ایمنؓ کے ساتھ کرادی۔ جن سے اُسامہ پیدا ہوئے۔ ہجرت کے بعد دوسری شادی حضرت زینب سے ہوئی۔ جو رسولِ خدا کی پھوپھی زاد بہن تھیں لیکن تعلقات ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے آپ نے ان کو طلاق دیدی۔

جہاں آپ صبر و استقلال میں اپنی مثال آپ تھے۔ وہاں بہادری میں بھی یکتا تھے۔ خاص کر تیر اندازی میں تو آپ خاص شہرت کے مالک تھے۔ سب سے پہلے آپ نے بدر کی لڑائی میں شرکت کی۔ اور بہادری کے خوب جوہر دکھائے۔ اس کے بعد ہر لڑائی میں آپ پورے جوش اور کمال خلوص سے حصہ لیتے رہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔ کہ جس فوج میں حضرت زید شریک ہوتے تھے۔ اس فوج کی سپہ سالاری اُن ہی کو ملتی تھی۔ آنحضرت صلعم نے آپ کو نو دفعہ سپہ سالار بنایا۔ یہ پہلی دفعہ قردہ کی لڑائی میں سپہ سالار بنائے گئے۔ آپ نے کامیابی کے ساتھ دشمن کو شکست دی۔ اور ان کے سردار فرات بن حیان عجلی کو گرفتار کرلیا۔ ۶ھ میں بنی سلیم کی مہم پر سپہ سالار بنا کر بھیجے گئے۔ تو وہاں بھی آپ فتح حاصل کرکے کامیاب واپس لوٹے۔

اسی سال آپ نے قریش کے تجارتی قافلہ کو روکنے کے لئے مقام حیص پر حملہ کیا۔ اور تمام قافلہ کو پکڑ کر لائے۔ قریش کے اس تجارتی قافلہ میں چاندی کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ جو مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔

اسی سال جب مقام حمیٰ پر فوج کشی کرنی پڑی۔ تو اس کی سپہ سالاری بھی

آپ ہی کے حصہ میں آئی۔ چنانچہ آپ پانچ سو بہادروں کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے دن کے وقت آپ کی فوج پہاڑوں میں چھپی رہتی تھی۔ اور رات کو سفر کرتی۔ حتیٰ کہ مقام حمی پر جا پہنچے۔ اس لڑائی میں آپ کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ ایک ہزار اونٹ پانچ ہزار بھیڑ بکریاں اور کافی تعداد میں قیدی لے کر واپس آئے چونکہ اس قافلہ کا ایک سردار بعد میں مسلمان ہوگیا تھا۔ اس لئے تمام قیدیوں کو رہا کرنے کے علاوہ تمام مال غنیمت واپس کر دیا۔

سنہ ھ میں آپ ایک تجارتی قافلہ کے ہمراہ شام کی طرف گئے۔ راستہ میں ڈاکوؤں نے اس قافلہ پر حملہ کیا۔ اور تمام مال لوٹ کرلے گئے۔ آپ بھی بال بال بچے۔ اور بڑی مشکل سے مدینہ پہنچے۔ جب رسولؐ خدا نے یہ واقعہ سنا۔ تو آنحضرت صلعم نے اس قبیلہ کو اس گستاخی کا مزا چکھانے کے متعلق ارشاد فرمایا۔ چنانچہ آپ کی سرداری میں ایک فوج بھیجی گئی۔ آپ نے بڑی دلیری اور ہوشیاری سے اس قبیلہ پر چھاپہ مارا۔ اور کامیاب لوٹے۔ مدینہ پہنچ کر سب سے پہلے رسولؐ خدا کے آستانہ مبارک پر پہنچے۔ آنحضرت صلعم نے آپ کو گلے لگایا۔ پیشانی کو چوما۔ اور حالات سن کر خوشی ظاہر فرمائی۔ جب سے آپ رسول خدا کی خدمت میں پہنچے تھے۔ اس وقت سے لیکر اخیر تک بے شمار سعادتیں آپ کے حصہ میں آئی تھیں آپ نے ہر تکلیف کو عین راحت سمجھا۔ سب سے بڑی سعادت جو باقی تھی آخر وہ بھی آپ کو مل گئی۔ آپ جنگِ موتہ میں شہید ہوئے۔ جس کی تفصیل یوں ہے

آنحضرت صلعمؐ نے حارث بن عمر کی معرفت ایک خط فرمانروائے بصرہ کے پاس بھیجا۔ لیکن جب وہ مقام موتہ میں پہنچے۔ تو عمرو بن شرجیل نے ان کو قتل کر دیا۔ اس لئے رسولؐ خدا نے ماہ جمادی الاوّل ۸ سنہ ھ میں بہادران اسلام کا ایک لشکر ترتیب دیا۔ جس میں تقریباً تین ہزار جان نثاران اسلام شامل تھے۔ آپ کو اس لشکر کا علمدار مقرر فرما کر ارشاد فرمایا۔ کہ اگر زید بن حارث شہید ہو جائیں۔ تو ان کے بعد جعفر بن ابی طالب کو اپنا سردار بنانا۔ اگر جعفر

بن ابی طالب بھی شہید ہو جائیں۔ تو عبداللہ بن رواحہ کو علمدار بنانا۔

چنانچہ یہ لشکر اسلام مدینہ شریف سے نکل کر جب مقام عمان پر پہنچا۔ تو وہاں معلوم ہؤا۔ کہ ہرقل شاہ روم نے ایک لاکھ رومیوں اور ایک لاکھ عربوں کے ساتھ فوج کشی کی ہے۔ اور یہ دونو لشکر سرزمین بلقا میں پڑاؤ ڈالے پڑے ہیں صرف تین ہزار جان نثاران اسلام اپنے مقابل دو لاکھ بہادروں کا گروہ سن کر دو راتیں عمان ہی میں مقیم رہے۔ اور سوچنے لگے۔ کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ آخر یہ رائے قرار پائی۔ کہ ایک خط کے ذریعے آنحضرت صلعم کی خدمت میں اس بات کی اطلاع دی جائے۔ اور دربارِ رسالت سے جو حکم پہنچے۔ اس پر عمل کیا جائے لیکن عبداللہ ابن رواحہ نے کہا۔ کہ اس انتظار میں بہت دن لگ جائیں گے دل کو مضبوط کر کے سب کھڑے ہو جاؤ۔ جس چیز سے ڈرتے ہو۔ خدا کی قسم وہ وہی چیز ہے۔ جس کے ذوق شہادت میں ہم سب گھر سے نکلے ہیں اگرچہ ہمارے مقابل جماعت کثیر ہے۔ لیکن ہم جمعیت کے لحاظ سے دشمن سے نہیں لڑتے۔ ہمارا لشکر اور ہماری قوت ہمارا اسلام ہے۔ اللہ تعالےٰ نے ہم کو آج تک اسی اسلام کی بدولت فتح مند کیا ہے" عبداللہ بن رواحہ کی اس حوصلہ افزا تقریر کے جواب میں سب جان نثاران اسلام نے یک زبان ہو کر کہا۔ بے شک تم سچ کہتے ہو۔ اور یہ کہتے ہی سب مسلمان اسی وقت عمان سے روانہ ہوئے۔ اور موضع شارف کے نواح میں جا ٹھیرے وہاں اُن کو ہرقل کا لشکر ملا۔ مگر مسلمانوں نے قریہ موتہ کی طرف حملہ کیا۔ اسی جگہ دونوں لشکروں کا مقابلہ ہؤا۔ اور آپس میں لڑائی ٹھن گئی۔

آپ کے ہاتھ میں آنحضرت صلعم کا علم تھا۔ اور بڑے جوش سے لڑ رہے تھے۔ یہاں تک کہ مخالفین کے لشکر میں جا گھسے۔ اور جام شہادت نوش کیا۔ اس لڑائی میں یکے بعد دیگرے جعفر ابن ابی طالب، عبداللہ بن رواحہ نے بھی شہادت کا مرتبہ حاصل کیا۔ آخر کار یہ جنگ خالد کی علمبرداری

میں فتح ہوئی۔

لوگوں نے رسول خدا کی خدمت میں پہلے ان سرداروں کی شہادت کی خبر سنا دی تھی۔ آنحضرت صلعم کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ حضرت زید کی بیٹی کو دیکھ کر آپ کا دل بھر آیا۔ اور آپ بھی رو دیے۔ لوگوں نے دریافت کیا۔ حضور یہ کیوں آپ نے فرمایا "یہ محبت کا جذبہ ہے"

محمّد بن قاسم

آپ گورنر بصرہ حجاج کے بھتیجے تھے۔ بچپن ہی سے بہت ذہین اور ہونہار تھے۔ حجاج نے آپ کے اچھے اطوار دیکھ کر پوری توجہ سے تربیت کی۔ اور آپ کی شادی اپنی لڑکی سے کر دی۔ ابھی آپ کی عمر پندرہ سولہ سال کی تھی۔ کہ آپ کو فارس کا حاکم بنایا گیا۔ آپ ایسے شیر دل بہادر تھے۔ کہ سترہ برس کی عمر ہی میں سندھ فتح کر کے فاتح سندھ کہلائے۔

جزائر سراندیپ سے کچھ جہاز جن میں مسلمان تاجروں کی بیوہ عورتیں اور یتیم بچے سوار تھے۔ بصرہ جا رہے تھے۔ اس زمانے میں سندھ کے ساحل پر دیبل کی مشہور بندرگاہ تھی۔ یہ جہاز اسی بندرگاہ پر آکر ٹھہرے۔ سندھ کے ڈاکوؤں نے ان جہازوں کو لوٹ لیا۔ اور بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کو پکڑ کر لے گئے۔ جب اس واقعہ کی اطلاع حجاج گورنر بصرہ کو پہنچی۔ تو وہ بہت برہم ہوا۔ اور خلیفہ ولید سے سندھ پر لشکر کشی کی اجازت مانگی۔ ساتھ ہی راجہ داہر کو لکھا۔ کہ ہمارے آدمیوں کو جو تمہارے سپاہیوں نے گرفتار کر لئے ہیں۔ فوراً ہمارے پاس بھیج دو۔ راجہ داہر نے جواب میں لکھا۔ کہ تمہارے آدمیوں کو ڈاکوؤں نے لوٹا ہے۔ جو میری اطاعت و حکومت سے باہر ہیں۔ راجہ داہر کے اس خشک جواب نے نہ صرف حجاج بلکہ تمام بہادران اسلام کو مشتعل کر

دیا۔ حجاج نے یکے بعد دیگرے دو سپہ سالار سندھ بھیجے۔ مگر انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ آخر اس نے محمدؐ بن قاسم کو اس مہم پر روانہ کیا۔ تاکہ وہ ہندوؤں کو اس دیدہ دلیری کا خوب مزا چکھائے۔

محمدؐ بن قاسم نے جس کی عمر اس وقت سترہ سال تھی۔ صرف چھ ہزار فوج کے ساتھ سندھ پر لشکر کشی کی۔ اور پہلے ہی حملہ میں دیبل فتح کر لیا تین دن کے بعد جب امن و امان قائم ہو گیا۔ تو محمدؐ بن قاسم نے اس جگہ چار ہزار مسلمان آباد کر کے جامع مسجد تعمیر کرائی۔

اس فتح کے بعد محمدؐ بن قاسم نیرون کی طرف بڑھا۔ لیکن ان لوگوں نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔ اور شہر ان کے حوالے کر دیا۔ نیرون میں بدھا کے مندر کی جگہ مسجد تعمیر کرائی گئی۔ اور اس میں ایک امام بھی مقرر کیا گیا۔

نیرون پر قبضہ کرنے کے بعد محمدؐ بن قاسم نے گزشتہ فتوحات کے ساتھ اہل نیرون کی اطاعت کے حالات لکھے۔ اور آگے بڑھنے کی اجازت طلب کی۔ حجاج اپنے جوان ہمت بھتیجے کی کامیابی کا حال سُن کر پھولا نہ سمایا۔ اس نے نہ صرف محمدؐ بن قاسم کو آگے بڑھنے کی اجازت دے دی بلکہ اپنے خط میں ایسا شوق دلایا۔ جس سے محمدؐ بن قاسم کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔ چنانچہ آپ نے سیوستان کے سامنے ڈیرے ڈال دیئے۔ اہل شہر نے مسلمانوں کی جانبازی اور بہادری کا حال پہلے ہی سُن رکھا تھا چنانچہ انہوں نے اپنے فوجی سرداروں کو لڑائی سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی مگر جب سردار اس بات پر آمادہ نہ ہوئے۔ تو رعایا نے اپنی جانیں بچانے کی خاطر محمدؐ بن قاسم کے پاس یہ پیغام بھیجا۔ کہ وہ تمام رعایا اپنے فوجی افسر بجہرا سے نفرت کرتی ہے۔ اور لڑنے پہ آمادہ نہیں۔ اس لئے امان دی جائے"۔ مگر محمد بن قاسم فوجی سرداروں کی رضامندی کے بغیر کس طرح

روک سکتا تھا۔ چنانچہ لڑائی شروع ہوئی۔ لڑائی کو جاری ہوئے ابھی چند ہی دن گزرے تھے۔ کہ بجھرا کے سپاہیوں نے بھی دل چھوڑ دیا۔ اور بجھرا رات کے اندھیرے میں جان بچا کر بھاگ نکلا۔ بجھرا کے بھاگنے کی دیر تھی۔ کہ رعایا اور فوج نے اطاعت قبول کر لی۔ اور محمدؐ بن قاسم کا قلعہ سیوستان پر قبضہ ہو گیا۔ سیوستان اور اس کے گردو نواح کا انتظام کرنے کے بعد محمدؐ بن قاسم نے قلعہ سیسم کی راہ لی۔ راستے میں دریائے کمبھ کے کنارے نلہان نام ایک مقام تھا۔ اس جگہ کے باشندے بدھ مذہب کے پیرو تھے۔ ان کے سردار کا نام کاکا تھا۔ کاکا نے جب بہادرانِ اسلام کو دیکھا تو محمدؐ بن قاسم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی اطاعت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ کہ "میں ہر معاملہ میں آپ کا ممد و معاون رہوں گا۔ اور آپ کے دشمنوں کو پسپا کرنے میں اپنی ہمت کے مطابق آپ کا ساتھ دونگا"۔ محمدؐ بن قاسم نے اس سردار کی رائے سے اتفاق کیا۔ اس ملک کے دستور کے مطابق کاکا کو ریشمی لباس پہنا کر سر پہ پگڑی باندھی۔ اور اس سرزمین کے نظم و نسق پر اسی کو مامور کر کے خود سیسم کے قریب جا کر دم لیا۔ سیسم کا قلعہ دو دن میں فتح ہو گیا۔ مفرور بجھرا اور دیگر بہت سے ہندو سردار اس لڑائی میں کام آئے۔ اور باقی ماندہ بھاگ گئے۔

راجہ داہر کو جب معلوم ہوا۔ کہ اسلامی فوج سیلاب کی طرح بڑھی چلی آرہی ہے۔ اور راستہ میں جو سامنے آتا ہے۔ اسے بہائے لئے آتی ہے۔ تو وہ بہت متفکر ہوا۔ اور اس نے ایک جرار فوج مسلمانوں کو روکنے کے لئے روانہ کی۔ ادھر مسلمان فوج دریائے سندھ کو عبور کر رہی تھی۔ کہ راجہ داہر کی فوج آ مقابل ہوئی۔ دونوں فوجیں بڑی بہادری سے لڑیں۔ لیکن آخرکار داہر کی فوج کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس لڑائی کے بعد محمدؐ بن قاسم نے ایک سفارت داہر کے دربار میں بھیجی۔ جو ایک عرب سفیر اور ایک نومسلم سردار

پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ جب داہر کے دربار میں پہنچے۔ تو اسلامی دستور کے مطابق نہ انہوں نے اس کے سامنے سجدہ کیا۔ اور نہ سر جھکایا۔ داہر اس حرکت کو برداشت نہ کرسکا۔ اسے سفیروں بالخصوص نومسلم سردار پر بہت غصّہ آیا۔ کیونکہ نومسلم سردار داہر کی رعایا میں سے تھا۔ چنانچہ راجہ داہر نے نہایت خشمگین انداز سے نومسلم سردار کو کہا۔ "تم آدابِ شاہی کیوں بجا نہیں لائے تمہیں اس سے کس نے روکا ہے؟" نومسلم سردار نے اس وقت جو جواب دیا۔ اس نے داہر اور اس کے درباریوں پر مذہب اسلام کی سچائی کو واضح کردیا۔ اور انہیں یقین ہو گیا۔ کہ مسلمان خدا کے سوا اور کسی سے نہیں ڈرتے۔ نومسلم سردار کا جواب یہ تھا۔ "جب تک میں آپ کی رعایا تھا اس وقت تک آپ کے درباری قانون کی پابندی مجھ پر لازم تھی۔ اب جبکہ میں نے دین اسلام قبول کرلیا ہے۔ تو یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ میں کسی مشرک کے سامنے سر جھکاؤں۔ کیونکہ اسلام میں سوائے خدا کے کسی اور کے سامنے سر جھکانا جائز نہیں ہے۔" اس جواب سے داہر بہت برافروختہ ہوا۔ تاہم غصّے کو ضبط کر کے کہا۔ "تم سفیر ہو۔ ورنہ قتل کر دیئے جاتے۔" اس پر نومسلم سردار نے جواب دیا۔ "میرے قتل سے مسلمانوں کا کچھ نقصان نہ ہوگا۔ البتہ وہ میرے خون کا پورا انتقام لیں گے۔ اور آپ کو سخت مصیبت کا سامنا کرنا پڑیگا۔" اس طرح سوال و جواب کے بعد مسلم سفیروں نے اپنے سپہ سالار کا پیغام دیا۔ مگر راجہ داہر نے وہ شرطیں قبول نہ کیں۔ اور سفارت ناکام واپس لوٹی۔

اب لڑائی شروع ہوئی۔ راجہ داہر نے بڑی کوشش کی۔ کہ مسلمان فوج دریائے سندھ کو عبور نہ کرسکے۔ چنانچہ اس نے اپنے بیٹے جے سنگھ کو اور اپنے ایک سردار راسل کو اس کام پر مامور کیا۔ مگر مسلمانوں نے چشم زدن میں اس رکاوٹ کو دور کر دیا۔ یعنی جے سنگھ میدان جنگ

سے بھاگ نکلا۔ اور راسل نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔ جب راجہ داہر کو اس ناکامی کا پتہ چلا۔ تو وہ اپنے تمام لشکر اور اہل و عیال سمیت قلعہ راور میں پناہ گزین ہو گیا۔

محمدؐ بن قاسم نے ۹۳ھ میں ماہ رمضان المبارک کی پہلی تاریخ کے دن شہر راور کا محاصرہ کر لیا۔ راجہ داہر نے قلعہ بند ہو کر بہادری کے خوب جوہر دکھائے۔ دس دن تک میدانِ کارزار گرم رہا۔ آخر کار جمعرات کے دن ماہ رمضان المبارک کی دسویں تاریخ مطابق جون ۷۱۲ء میں راجہ داہر ایک عرب مسلمان کے ہاتھوں قتل ہوُا۔ اس شاندار فتح کے لیے مسلمانوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اگرچہ مسلمان دن بھر کے تھکے ماندے تھے۔ مگر اس فتح کی خوشی میں رات بھر نیند نہیں آئی۔ اور اکثر تمام رات عبادت الٰہی میں مصروف رہے۔ قلعہ تو فتح ہو گیا۔ مگر ہندوؤں میں ابھی دم خم باقی تھا۔ چنانچہ انہوں نے شہر راور میں جمع ہو کر لڑائی کا سامان کرنا شروع کر دیا۔ بہادر محمدؐ بن قاسم نے یہ حالت دیکھ کر اپنی فوج کو مرتّب کیا۔ اور شہر پہ دھاوا کر دیا۔ چند روزہ کی مسلسل سنگباری اور آتشبازی سے فصیل کے سب بُرج توڑ کر گرا دیئے گئے جب محصورین کو اپنی شکست کا یقین ہو گیا۔ تو راجہ داہر کی رانی اور اس کی خواصوں نے خود کشی کر لی۔ اور راجہ کے باقی متعلقین و ملازمین گرفتار ہوئے۔ محمدؐ بن قاسم نے مکمل فتح حاصل کرنے کے بعد فتح کی خوشخبری اور مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ حجاج کی خدمت میں بھیج دیا۔ حجاج نے یہ سب کچھ دربارِ خلافت میں روانہ کر دیا خلیفہ ولید نے حجاج کا خط پڑھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کامیابی کے بعد مسلمان آگے بڑھے۔ اور انہوں نے پنجاب کے بہت بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ اور ملتان کو اپنی حکومت کا مرکز بنایا۔ اس زمانہ میں

سندھ کی حدیں بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ملتان بھی سندھ ہی کا ایک شہر سمجھا جاتا تھا۔ ملتان کو فتح کرنے کے بعد محمدؒ بن قاسم نے یہاں ایک جامع مسجد بنوائی۔ غرض سندھ کے پورے علاقے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

محمدؒ بن قاسم نے مفتوحہ علاقہ کا انتظام اس خوش اسلوبی سے کیا۔ کہ باشندے خوشحال ہو گئے۔ دراصل اس زمانہ میں سندھ کے ہندو حکمران نالائق تھے۔ راجہ داہر اور اس کے اراکین سلطنت عیش و عشرت میں مستغرق رہتے تھے۔ سندھ کے باشندے ان کے ظلم و ستم سے عاجز آ چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے اسلامی فوجوں کا نہایت خوشی کے ساتھ استقبال کیا۔ اور ان کی ہر طرح سے امداد کی۔

محمدؒ بن قاسم بڑا روادار اور آزاد خیال حکمران تھا۔ اس نے ہندوؤں کے مذہبی معاملات میں بالکل دخل نہیں دیا۔ اور نہ ہندوؤں کے عبادت خانوں ہی کو کسی قسم کا نقصان پہنچایا۔ اس نے ہندوؤں کو ہر قسم کی آزادی دے رکھی تھی۔ ان پر کسی قسم کی سختی یا جبر نہ تھا۔ محمدؒ بن قاسم نے سلطنت کے انتظام کا کام بھی عام طور پر ہندوؤں کے سپرد ہی رہنے دیا۔ راجہ داہر کے وزیر اعظم کو اپنا وزیر بنایا۔ سندھ والوں کے ساتھ محمدؒ بن قاسم کا سلوک بہت اچھا تھا۔ جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔

حضرت سعد ابن ابی وقاص

مکہ میں آپ کا خاندان بہت مشہور تھا۔ اس کے متعلق صرف اتنا لکھ دینا کافی ہے۔ کہ آپ رسول خدا کے چچا زاد بھائی تھے۔ انیس برس کی عمر میں آپ نے اسلام قبول کیا۔ اس وقت تک صرف سات یا آٹھ آدمی مسلمان ہوئے تھے۔ آپ کی والدہ کو آپ کے مسلمان ہونے کا علم ہوا۔ تو وہ بہت ناراض ہوئیں۔ مگر آپ اس سے قطعاً متاثر نہ ہوئے۔ شروع شروع میں مسلمان چھپ چھپ کر نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ ایک دن گھاٹی میں چھپ کر نماز پڑھ رہے تھے۔ کہ چند لوگوں نے دیکھ لیا۔ اور وہ ہنسی اڑانے لگے آپ کی اسلامی غیرت جوش میں آئی۔ اور آپ نے اونٹ کی ایک ہڈی اٹھا کر ان پر پھینکی۔ جس سے ایک کا سر پھٹ گیا۔

رسولؐ خداؐ اور ان کے جان نثار مسلمان جب ہجرت کر کے مدینہ آئے۔ اور انصار نے ان کو پناہ دی۔ تو نہ صرف مکہ کے قریش بلکہ عرب کے سارے لوگ ان سے لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ مسلمانوں کو چونکہ چاروں طرف سے خطرہ تھا۔ اس لئے مہاجرین راتوں کو ہتھیار باندھ کر سوتے تھے۔ ایک رات خطرہ بہت تھا۔ رسول خدا نے اس رات مسلمانوں میں سے سب سے بہادر آدمی کو پہرہ کے لئے منتخب فرمایا۔ یہ سعادت آپ کے حصہ میں آئی تھی۔

بدر کی لڑائی میں مسلمانوں کی تعداد صرف ۳۱۳ تھی۔ اور کفار کی فوج دو ہزار تھی۔ اس لڑائی میں حضرت سعد بڑی بہادری سے لڑے۔ اور دشمن کے کئی سرداروں کو قتل کیا۔ اسی طرح احد کی لڑائی میں بھی آپ نے پورے استقلال اور جوانمردی سے حصہ لیا رسول خداؐ نے اپنا ترکش ان کے آگے ڈال کر فرمایا۔ "تم پر میرے ماں باپ قربان تیر مارتے جاؤ۔" اور پھر آنحضرتؐ نے ایک دشمن کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ "اے سعد۔ اس پر تیر چلاؤ۔"

ایک دفعہ آپ بہت سخت بیمار ہو گئے۔ اس موقع پر رسولؐ خدا نے دعائے صحت کے بعد فرمایا۔ "تم اس وقت تک جیو گے۔ جب تک ایک قوم کو تم سے فائدہ اور دوسری کو نقصان نہ پہنچ جائے گا۔" چنانچہ آپ تندرست ہو گئے۔ اور رسولؐ خدا کی یہ پیشین گوئی عراق کی فتح سے پوری ہوئی۔

جنگ قادسیہ میں پہلے پہل آپ کو فوج کا سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ یہ مہم اتنی اہم تھی کہ اس کی سپہ سالاری خود حضرت عمرؓ نے اپنے ہاتھ میں لی تھی۔ چونکہ دارالخلافہ کو خالی چھوڑنا بھی مناسب نہ تھا۔ اور کوئی دوسرا شخص اس بار گراں کو اٹھانے کے قابل نہیں ملتا تھا۔ آخر سب کی نظر انتخاب آپ پر پڑی۔ آپ بیس اکیس ہزار فوج لے کر مدینہ سے نکلے۔ اور قادسیہ کے مقام پر جا ڈیرے ڈالے۔ حضرت عمرؓ کی ہدایت کے مطابق پہلے آپ نے چودہ آدمی جو ہر حیثیت میں سفارت کے قابل تھے۔ شاہ ایران کے دربار میں بھیجے۔ مگر شاہ ایران سفارت کے یہ الفاظ سن کر کہ "اسلام قبول کرو۔ یا جزیہ دو۔ یا جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔" غصے سے بے تاب ہو گیا۔ اور مٹی کا ایک ٹوکرا مسلمانوں کو دے کر

رخصدت کیا۔ وہ یہ خوشخبری لے کر آپ کے پاس پہنچے۔ کہ فتح مبارک دشمن نے اپنی زمین خود ہی ہم کو دے دی۔

پہلا مورچہ قادسیہ کے مقام پر لگایا گیا۔ طرفین نے زبردست تیاریاں کر کے لڑائی کا میدان گرم کر دیا۔ تین دن تک سخت لڑائی ہوئی۔ آخر رستم جو ایرانیوں کا سپہ سالار تھا۔ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ ایرانیوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ مسلمانوں کو شاندار فتح حاصل ہوئی اور بے شمار مال غنیمت ان کے ہاتھ لگا۔

قادسیہ کی فتح کے بعد فوج آپ کی سرداری میں مدائن کی طرف بڑھی۔ راستے میں بابل اور سابلط پر قبضہ کرتے ہوئے مدائن کے نزدیک پہنچ گئے۔ مدائن کے وسط میں دریائے دجلہ بہتا تھا ایرانیوں نے پل توڑ دیا۔ تاکہ مسلمان دریا کے پار نہ جا سکیں۔ مگر آپ کے توکل کا یہ حال تھا۔ کہ آپ نے بسم اللہ کہہ کر گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ اسلامی فوج نے اپنے سردار کی یہ بہادری دیکھی۔ تو انہوں نے بھی اپنے گھوڑے ان کے پیچھے کر دیئے۔ اور بڑے اطمینان کے ساتھ کنارے تک پہنچ گئے۔ ایرانی مسلمانوں کی یہ بہادری دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ایرانی فوجیں "دیو آگئے! دیو آگئے" کہتی ہوئی بھاگ گئیں۔ اور مدائن آسانی کے ساتھ مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔

مدائن کی فتح کے بعد ایرانیوں نے جلولا میں جنگ کی تیاریاں شروع کیں۔ اور ایک بڑی فوج جمع کر لی۔ ایرانیوں نے بڑی حکمت عملی سے کام لیا۔ یعنی شہر کے گرد ایک خندق کھود کر چاروں طرف کانٹے بچھا دیئے۔ آپ نے بھی حضرت عمر کی ہدایات کے بموجب فوج کو ترتیب دیا۔ اسلامی فوج تقریباً دو مہینے تک

قلعہ کے باہر پڑی رہی - ایرانی وقتاً فوقتاً قلعہ سے باہر نکل کر حملہ آور ہوتے تھے - اس طرح کئی معرکے ہوئے - لیکن ایرانیوں نے ہمیشہ شکست کھائی - آخر ایرانیوں نے سامان رسد ختم ہو جانے کے باعث قلعہ سے نکل کر پوری قوت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کر دیا - مسلمانوں نے بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا - اتنے میں اس زور کی آندھی چلی کہ زمین و آسمان میں اندھیرا چھا گیا - ایرانی بد حواس ہو کر پیچھے ہٹے - اور بہت سے اپنی کھودی ہوئی خندق میں خود ہی گر کر مر گئے - ایرانیوں نے یہ دیکھ کر کئی جگہ سے خندق کو پاٹ کر راستہ بنایا - مسلمانوں نے اس موقعہ کو غنیمت جانا - اور پیچھا کر کے ایسے پُر زور حملے کئے - کہ ایرانیوں کے پاؤں اکھڑ گئے - مسلمانوں نے قلعہ اور شہر پر قبضہ کر لیا - اور بے شمار مال و دولت اور زر و جواہرات ہاتھ آیا -

آپ نے فتح کی خوشخبری کے ساتھ پانچواں حصہ حضرت عمر کی خدمت میں بھیجا - جو انہوں نے اصول کے مطابق تقسیم کر دیا -

شاہ ایران کو جلولا کی شکست کی خبر پہنچی - تو حلوان کو چھوڑ کر رے روانہ ہوا - اور ایک معزز افسر خسرو شنوم کو چند رسالوں کے ساتھ حلوان کی حفاظت کے لئے چھوڑتا گیا - جب آپ کو حالات کا علم ہوا - تو آپ نے قعقاع کی سرداری میں بارہ ہزار فوج کو اس طرف بڑھنے کا حکم دیا - خسرو شنوم نے تین میل آگے بڑھ کر قصر شیریں پر مسلمانوں کا مقابلہ کیا - لیکن شکست کھا کر رے کی طرف بڑھ گیا - قعقاع نے حلوان پہنچ کر مقام کیا - اور ہر طرف امن کی منادی کرا دی - اطراف کے رئیس آ کر جزیہ قبول کرتے جاتے تھے - اور اسلام کی حمایت میں آتے جاتے تھے - یہ فتح عراق کی فتوحات کا خاتمہ تھی - گویا پورے عراق پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا -

حضرت عمر نے آپ کو اس علاقے کا گورنر مقرر کر دیا۔ آپ نے اس علاقہ کا بہترین انتظام کیا۔ پوری جانچ کے ساتھ مردم شماری کے کاغذات مرتب کئے۔ کل باشندوں اور اہل فوج کی تعداد کا موازنہ کیا گیا۔ تو ایک ایک مسلمان کے حصے میں تین تین آدمی پڑتے تھے۔ مگر فیصلہ یہ کیا گیا۔ کہ زمین سابقہ باشندوں کے قبضہ میں رہنے دی جائے۔ اور ان کو ہر طرح سے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ اس کے بعد آپ نے حضرت عمر کے حکم کے مطابق ایک نیا شہر بسایا۔ جس کا نام کوفہ رکھا۔ اس میں مختلف قبیلوں کے لئے الگ الگ محلے تھے۔ جامع مسجد اور ایوان حکومت کی عمارتیں نہایت شاندار تھیں۔ ابن بطوطہ جس نے آٹھویں صدی میں اس مقدس مقام کو دیکھا تھا۔ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے۔ کہ سعد بن وقاص نے جو ایوان حکومت بنایا تھا۔ اس کی بنیاد اب بھی قائم ہے۔

حضرت عمرؓ نے انتقال کے وقت چھ اشخاص کے نام خلافت کے لئے تجویز کئے۔ اور فرمایا۔ کہ ان میں سے جس کی نسبت کثرت رائے ہو۔ وہ خلیفہ منتخب کر لیا جائے۔ ان چھ اشخاص میں بھی آپ کا نام تھا۔

حضرت عثمان کے زمانہ میں بھی آپ نے تین سال تک عراق پر حکومت کی۔ اور ان کے بعد مدینہ سے دس میل کے فاصلے پر گھر بنا کر گوشہ نشینی اختیار کی۔ اور عبادت الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ آخر ستر برس کی عمر میں ۵۵ھ میں آپ نے انتقال فرمایا۔

رضیہ سُلطانہ

مسلمان بادشاہ اور اُمراء اپنے غلاموں کو جیسی اچھی طرح رکھتے تھے۔ اور جیسا عمدہ سلوک اُن کے ساتھ کرتے تھے۔ دنیا کی تاریخ میں کوئی اور قوم اپنے غلاموں سے اس طرح پیش نہیں آئی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے مسلمانوں کو اپنے غلاموں کے ساتھ نیک برتاؤ کی نہایت تاکید کی تھی۔ اور حکم دیا تھا کہ نہ اُن کو مارو نہ جھڑکو۔ نہ اُن سے بہت زیادہ محنت اور مشقت کا کام لو۔ جو خود کھاتے ہو۔ وہ اُن کو کھلاؤ۔ جو خود پہنتے ہو۔ اُن کو پہناؤ۔ اُن کو غلام کہہ کر نہ پکارو۔ بلکہ بیٹا یا بھائی کہو۔ آنحضور نے یہ نہ صرف حکم دیا تھا۔ بلکہ آپ نے عملی نمونہ بھی اس معاملہ میں اتنا عمدہ دکھایا۔ کہ دنیا حیران رہ گئی۔ حضورؐ نے اپنے غلام زید سے اتنا شفقت کا برتاؤ کیا۔ کہ جب اس کا باپ آیا۔ اور اُسے اپنے ساتھ لے جانے لگا۔ تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ کہ میں حضورؐ کے پاس سے نہیں جاؤں گا۔ حضور اُس سے ایسی مُحبّت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ کہ وہ زید بن محمدؐ مشہور ہو گیا۔ سلمان ایک فارسی غلام تھا جن کے متعلق حضورؐ نے فرمایا۔ کہ ہمارے

اہل بیت میں سے ہے۔ ایک اور غلام بلال رضؓ تھے۔ جو اگرچہ حبشی تھے مگر آج ساری دنیا کے مسلمان اُن کو بڑی عزّت سے یاد کرتے ہیں اور جس روز اُن کا انتقال ہوا۔ تو عمر جیسے زبردست شہنشاہ نے جن کی ہیبت سے ساری دنیا کے بادشاہ کانپ رہے تھے۔ روتے ہوئے یہ فرمایا۔ کہ افسوس آج دنیا سے ہمارا آقا اُٹھ گیا۔

اِسی تعلیم اور اسی نمونہ کا اثر تھا۔ کہ بعد میں مسلمان بادشاہوں نے غلاموں کے ساتھ حسنِ سلوک میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی اُن کو ہر قسم کا اعزاز اور مرتبہ بخشا۔ اور بڑے سے بڑے عُہدوں پر اُن کو مقرر کیا۔ یہاں تک کہ سلطنتیں اور بادشاہتیں اُن کو بخش دیں۔ سلطان محمود غزنوی جس نے ہندوستان پر ۱۷ حملے کئے اور ہندوستان کے سارے راجہ جمع ہو کر بھی اُس کا مقابلہ نہ کر سکے وہ ایک غلام زادہ تھا۔ قطب الدین ایبک جو دہلی کا بادشاہ تھا۔ اور لکھ داتا کے نام سے مشہور ہے۔ محمدؐ غوری کا غلام تھا۔ قطب الدین کے غلام شمس الدین التمش نے نہایت شان کے ساتھ ۲۶ برس تک دہلی کے تخت پر حکومت کی ہے۔

اسی شمس الدین کی لڑکی رضیہؔ سلطانہ تھی۔ جس کا حال تمہیں آج سناتے ہیں:۔

شمس الدین التمش کے دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ لڑکوں کے نام رکن الدین اور بہرام تھے۔ اور لڑکی کا نام رضیہؔ تھا۔ لڑکے تو دونوں نالائق تھے۔ مگر لڑکی نہایت ہوشیار۔ عقلمند۔ چُست و چالاک اور بہادر تھی۔ اسی وجہ سے بہ نسبت لڑکوں کے بادشاہ لڑکی کو بہت چاہتا تھا۔ اُس نے بڑی محبت سے رضیہ کی تربیّت میں کوشش کی۔ اُس کو تمام مروجہ علوم تاریخ۔ جغرافیہ۔ حساب۔ قرآن۔ حدیث

اور فقہ کی اعلیٰ تعلیم دلائی۔ فنونِ سپہ گری میں بھی اُسے طاق کیا۔
تلوار بہت اچھی چلاتی تھی۔ وہ اعلیٰ درجہ کی نشانہ باز تھی۔ گھوڑے
کی سواری بہت اچھی کر سکتی تھی۔ غرض بڑی بہادری کے ساتھ باپ
کے پہلو بہ پہلو دشمنوں کا مقابلہ کیا کرتی تھی۔ باپ سے بڑے ادب
سے پیش آتی۔ اور ہر چھوٹے بڑے سے بڑے اخلاق کے ساتھ ملتی
تھی۔ باپ اُس کی لیاقت اور قابلیت سے بہت خوش تھا۔ اور
بیٹوں کی نالائقی سے جلتا رہتا تھا۔ آخر یہ ہوا۔ کہ اُس نے اپنا
ولیعہد رضیہ کو بنا دیا۔ اور دونوں بیٹوں کو بادشاہت سے محروم
کر دیا۔ کیونکہ وہ بادشاہت کے لائق ہی نہ تھے۔ لیکن جب ۱۲۳۶ء
میں سلطان شمس الدین التمش کا انتقال ہو گیا۔ تو درباری امراء نے
ایک عورت کی حکومت کو پسند نہ کیا۔ اور سلطان کے بڑے بیٹے
رکن الدین فیروز شاہ کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ مگر یہ بہت نالائق اور نااہل
ثابت ہوا۔ اور بہت جلد سلطنت کے امراء اس سے تنگ آ گئے۔
اتفاقاً انہی ایام میں ملتان کے حاکم ملک اعز الدین نے بغاوت کی
اُسے سزا دینے کے لئے رکن الدین فوج لے کر ملتان روانہ ہوا۔ امراء تو
موقع کے منتظر تھے ہی۔ اُدھر بھائی تو ملتان گیا۔ اور اِدھر اُنہوں نے
دہلی میں بہن کو تختِ شاہی پر بٹھا دیا۔ رکن الدین نے یہ خبر سنی۔ تو واپس
آیا۔ دونوں فوجوں میں سخت مقابلہ ہوا۔ جس میں رکن الدین کو شکست
ہوئی۔ وہ قید کر لیا گیا۔ اور قید ہی میں مر گیا۔ اس کی حکومت کی مدت
۶ ماہ اور ۲۸ یوم تھی

رضیہ میں حکومت کی پوری قابلیت تھی۔ اور اُس نے بڑی شان
سے سلطنت کرنی شروع کی۔ یہ بڑی وسیع مملکت کی مالک تھی۔ جو
کوہ ہمالیہ سے بندھیاچل تک اور دریائے سندھ سے دریائے برہم پُتر

تک پھیلی ہوئی تھی۔ رضیہ مردانہ لباس پہن کر دربار کرتی۔ اور جنگ کے وقت اپنی فوج کی کمان خود کرتی۔ چونکہ فنونِ جنگ سے بخوبی واقف تھی۔ اس لئے فوج کو بہت اچھی طرح لڑاتی۔ نہایت تجربہ کار۔ مدبر اور باہمت عورت تھی۔ اس نے کئی ہندو راجاؤں کا مقابلہ کیا۔ اور کامیاب ہوئی۔ ملک کے مختلف حصّوں کے جن جن صوبیداروں اور حاکموں نے اُس کے عہد میں بغاوت کی۔ اُس نے خوب اچھی طرح اُن کی خبر لی۔ اور سب کو زیر کیا۔ ابھی اس کو سلطنت کرتے دو ڈھائی سال ہوئے تھے۔ کہ ترکی امراء اس کے خلاف ہو گئے اور اُسے پکڑ کر بھٹنڈہ کے قلعہ میں قید کر دیا۔ اور دہلی میں اس کے دوسرے بھائی بہرام شاہ کو تخت پر بٹھا دیا۔ رضیہ نے یہ کام کیا۔ کہ بھٹنڈہ کے حاکم ملک التونیہ سے شادی کر لی۔ اور پھر شوہر اور بیوی دونوں نے مل کر بہرام شاہ پر حملہ کر دیا۔ مگر شکست کھائی۔ دوبارہ تیاری کر کے پھر حملہ کیا۔ اس دفعہ وہ اور اس کا شوہر دونوں دشمنوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہو گئے۔ اور انہوں نے دونوں کو مار ڈالا۔ رضیہ ۱۲۳۶ء میں تخت پر بیٹھی تھی۔ اور ۱۲۴۰ء میں قتل کی گئی۔

اگرچہ رضیہ کا انجام اچھا نہیں ہوا۔ لیکن اس میں شبہ نہیں۔ کہ وہ نہایت قابل اور لائق فرمانروا تھی۔ اور امراء اگر اپنی جہالت سے اس کی مخالفت نہ کرتے۔ تو اس کا زمانۂ حکومت نہایت شاندار ہوتا۔ ہندوستان کے تمام مسلمان بادشاہوں میں صرف رضیہ ایک عورت تھی۔ جو بادشاہ ہوئی۔ نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد کسی عورت کو بادشاہ ہونا نصیب ہوا۔

اِبنِ بطوطہ

ابو عبداللہ محمدؒ عرف ابنِ بطوطہ ۲۴، فروری ۱۳۰۴ء کو شہر تنجیر میں پیدا ہوا۔ تنجیر شمالی امریکہ میں مراکش کی ایک بندرگاہ ہے۔ جو آبنائے جبل الطارق کے کنارے واقع ہے۔

ابن بطوطہ ۲۱ برس کی عمر میں حج کرنے کی غرض سے مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس زمانے میں ملک شام کے دارالخلافہ دمشق سے حاجیوں کے قافلے حجاز روانہ ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ ابنِ بطوطہ ایسے کسی قافلے کا ساتھ حاصل کرنے کے لیے دمشق کی جانب چل دیا۔ جب وہ فلسطین کی سیر کرتا ہوا دمشق پہنچا۔ تو اُسے معلوم ہوا۔ کہ قافلوں کی روانگی میں ابھی دیر ہے۔ اس موقع کو غنیمت جان کر اُس نے جی بھر کر سیر کی۔ اور مقررہ وقت پر ایک قافلہ کے ہمراہ مکہ کی راہ لی۔ حج کے بعد ابنِ بطوطہ نجف پہنچا۔ تاکہ حضرت علیؓ کے مزار مقدس کی زیارت کر سکے۔ نجف سے بصرہ اور پھر خوزستان کے پہاڑوں کو پار کر کے اصفہان اور شیراز پہنچا۔ روانگی کے وقت گو اس کا ارادہ محض حج کرنے کا تھا۔ مگر شام، عراق اور ایران کے سفر نے اسے سیاحت کی لذتوں اور دلچسپی سے واقف کر دیا۔ چنانچہ ایران پہنچ کر اس نے دوسرے علاقوں کی سیاحت کا بھی تہیہ کر لیا۔

وہ ایران سے مکہ معظمہ آیا۔ اور دوسری بار حج کیا۔ اور علم حاصل

کرنے کی غرض سے پورے تین مہینہ یہیں ٹھہرا رہا۔ اُس زمانے میں ہندوستان کا بادشاہ محمد تغلق تھا۔ جس کی سخاوت اور علم دوستی کی شہرت دُور دراز تک پھیلی ہوئی تھی۔ چنانچہ ابن بطوطہ نے تحصیل علم سے فارغ ہو کر ہندوستان پہنچنے کا ارادہ کر لیا۔ مگر وہ پہلے اپنے چند شاگردوں کو لے کر عدن پہنچا۔ اور پھر عدن سے روانہ ہو کر افریقہ کے مشرقی ساحلی علاقوں کی سیر کی۔ اس کے بعد ان شہروں کی بھی سیر کی۔ جو خلیج فارس کے کنارے آباد تھے۔ آخرکار صحرائے عرب پار کر کے مکہ پہنچ کر تیسری بار حج کیا۔ حج کرنے کے بعد وہ مصر اور شام میں سے ہوتا ہوا اناطولیہ کی ایک بندرگاہ پر جا پہنچا۔

اناطولیہ کی سیر کے بعد بحیرہ اسود کو پار کر کے ابن بطوطہ وسط ایشیا کی منگول سلطنت میں جا داخل ہوا۔ منگول بادشاہ خاں ازبیگ نے اسے اپنے درباریوں میں شامل کر لیا۔ چنانچہ ابن بطوطہ نے منگول سلطنت کی سیاحت سے جی بھر کر ارمان نکالے۔ اس نے شہر بلغار کے متعلق سن رکھا تھا۔ کہ گرمیوں میں وہاں راتیں بہت ہی چھوٹی اور سردیوں میں دن بہت ہی چھوٹے ہوتے ہیں۔ ابنِ بطوطہ نے خان سے اجازت لے کر اس شہر کا رُخ کیا۔ اتفاق سے وہ رمضان کا مہینہ تھا۔ ابنِ بطوطہ کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے دیکھا۔ کہ روزہ افطار کرنے کے بعد وہ نمازِ عشا ادا کرنے ہی پاتے تھے۔ کہ سحر کا وقت ہو جاتا تھا۔ وہاں اُس نے یہ بھی سنا۔ کہ شمال کی جانب ایک ایسا علاقہ ہے۔ جس میں کتنا کتنا عرصہ رات ہی رہتی ہے۔ مگر رستہ کی مشکلات کی وجہ سے ابنِ بطوطہ نے وہاں جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

جب ابن بطوطہ خان کے دربار میں واپس پہنچا۔ تو تھوڑے ہی عرصہ بعد اُسے خان کی ایک یونانی نسل کی ملکہ کی خدمت میں قسطنطنیہ جانے کا موقع مل گیا۔ قسطنطنیہ سے ابنِ بطوطہ پھر گھاس کے میدانوں میں سے گزرتا ہوا خوارزم اور بخارا پہنچا۔ اور پھر خراسان اور کابل کی راہ سنہ ۱۳۳۱ء میں ہندوستان میں

داخل ہوا۔ اس سفر سے اس کی ایک دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ اور وہ دریائے سندھ کے کنارے کنارے سمندر تک سفر کرنے کے بعد ملتان پہنچا ملتان کا حاکم بڑی عزت سے پیش آیا۔ کچھ دیر یہاں قیام کرنے کے بعد ابن بطوطہ محمد تغلق کے دربار میں پہنچ گیا۔ بادشاہ نے اسے شہر کا قاضی مقرر کر دیا۔ مسلسل آٹھ برس تک وہ اس عہدہ پر فائز رہا۔ ان دنوں سلطان محمد تغلق کو شاہ چین کے دربار میں سفیر بھیجنے کی ضرورت پڑی۔ اس مقصد کے لیے بادشاہ نے ابن بطوطہ کو منتخب کیا۔ چنانچہ ابن بطوطہ اپنے ساتھیوں کو ہمراہ لیے دہلی سے کالی کٹ روانہ ہوا۔ بدقسمتی سے علیگڑھ کے قریب وہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر ہندو ڈاکوؤں کے چنگل میں پھنس گیا۔ قسمت یاور تھی۔ بچ نکلا۔ اور گرتا پڑتا کالی کٹ جا پہنچا۔ مگر اس دوران میں اس کے سب ساتھی چین روانہ ہو چکے تھے۔ ان حالات میں اُس نے دہلی واپس لوٹنا مناسب نہ سمجھا۔ اور ساحلِ مالابار کی چھوٹی چھوٹی مسلمان آزاد ریاستوں کی سیاحت شروع کر دی۔ ان دنوں جزائر لکادیپ میں ایک مسلمان ملکہ حکمران تھی۔ جس نے ابن بطوطہ کی قابلیت سے متاثر ہو کر اسے قاضی کے عہدہ پر مامور کر دیا۔ مگر کچھ عرصہ ٹھہرنے کے بعد اس نے لنکا اور مغربی ہند کا رُخ کیا۔ اور ان علاقوں میں گھومتا ہوا بنگال جا پہنچا۔ اُس زمانہ میں بنگال میں ضروریاتِ زندگی کی چیزیں اتنی سستی تھیں۔ کہ موٹے موٹے پلے ہوئے مُرغ ایک درم کے آٹھ، کبوتر ایک درم کے ۱۵ اور دُنبے دو دو درم بکتے تھے۔ مگر آب و ہوا ناموافق تھی۔ چنانچہ اہلِ خراسان بنگال کو اچھی اچھی چیزوں سے بھرا ہوا جہنم کہتے تھے۔

بنگال سے روانہ ہو کر ابنِ بطوطہ سماٹرا اور کمبودیا ہوتا ہوا چین کی

عظیم الشان بندرگاہ زیتون (موجودہ ایموئے) پہنچا - ابنِ بطوطہ کی رائے کے مطابق یہ بندرگاہ دنیا کی سب سے بڑی بندرگاہ تھی - ہر مکان کے ساتھ ایک چھوٹا سا باغ اور چھوٹا سا کھیت تھا - بندرگاہ میں سینکڑوں بڑے اور ہزاروں چھوٹے جہاز ہروقت موجود رہتے تھے -

چین کی سیاحت کرتے کرتے ابنِ بطوطہ شہنشاہ چین کے پایۂ تخت پیکن تک جا پہنچا - مگر شہنشاہ سے ملاقات نہ کرسکا - چین کی سیاحت کے بعد ابنِ بطوطہ نے واپس وطن آنے کی ٹھانی - چنانچہ زیتون کی بندرگاہ سے روانہ ہو کر سماٹرا، مالابار، عمان اور ایران کی بندرگاہوں سے ہوتا ہوا فلسطین پہنچا - بیت المقدس کی زیارت کے بعد مصر کا رُخ کیا پھر چوتھی اور آخری بار حج کرنے کے بعد مراکش کی راہ لی - آخرکار ۸ نومبر ۱۳۴۹ء کو چوبیس برس کی طویل سیاحت کے بعد ابنِ بطوطہ شہر فیض کی چار دیواری میں داخل ہوا - جب وہ اپنے وطن تنجیر پہنچا - تو اس نے اندازہ لگایا - کہ اندلس اور دریائے نائیجریا کے علاقے کی اسلامی حکومتوں کے سوا وہ تمام اسلامی سلطنتوں کی سیاحت کرچکا ہے چنانچہ اس نے ان ممالک کی سیاحت کرنے کی ٹھان لی - اور وہ فی الفور آبنائے جبل الطارق پار کرکے اندلس پہنچ گیا - اور وہاں سے سیدھا حبشی اسلامی ریاستوں کا رُخ کیا - ابھی وہ ان سلطنتوں کی سیاحت میں مصروف تھا - کہ مراکش کے بادشاہ ابوعنان فارس نے اسے بلا بھیجا شاہی فرمان کے مطابق اس نے اپنی سیاحت کی تمام داستان محمد ابن جوزی کو کتابی صورت میں لکھا ڈالی - آخرکار اس مشہور سیاح نے ۷۳ برس کی عمر میں وفات پائی ؂

امام غزالیؒ

پانچویں صدی ہجری کے وسط میں مشرق میں مسلمانوں کا دستِ اقتدار ڈھیلا پڑ گیا تھا عالمِ اسلام کی وہ عظیم الشّان سلطنت جس میں ایک وقت میں انتہا درجہ کی یک جہتی اور استحکام تھا۔ اب اس میں بدنظمی اور طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا ہسپانیہ شمالی افریقہ اور مصر خلیفہ بغداد کے قبضہ سے نکل چکے تھے، شمالی شام اور عراق باغی عرب سرداروں کے ہاتھ آ گئے تھے۔ فارس کئی ایک چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں بٹ چکا تھا۔ جو ایک دوسرے سے ہر وقت آمادۂ پیکار نظر آتی تھیں القصہ اسلامی سلطنت پارہ پارہ ہو گئی تھی۔ اور اس کی شیرازہ بندی کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

ان ناگفتہ بہ حالات میں سلجوقی ترکوں نے اسلام قبول کیا اور اپنے جنگجویانہ خصائل اور نئے مذہب کی سرمستی اور جوش وخروش کی بنا پر نہ صرف اس زوال پذیر اسلامی سلطنت کو از سرِ نو اپنے پاؤں پر کھڑا کیا بلکہ اسے زندگی کی اِک نئی شاہراہ پر بھی چلایا سلجوقی ترک دُرشت خو اور عسکری اطوار کے حامل تھے۔ انہوں نے اگرچہ ملکی فتوحات کے ذریعہ اسلامی قوّت کو فروغ دیا تھا۔ مگر عسکری فتوحات کسی سلطنت کے بقا اور استحکام کے لئے کافی نہیں ہوتی ہیں۔ لہٰذا اس امر کی شدّت سے ضرورت محسوس ہوئی کہ سلطنت کی از

سرِ نو تاسیس وتنظیم کی جائے اور اُس کی بنیاد احیاء مذہب اور ثقافتی نشاۃ ثانیہ پر رکھی جائے۔ چنانچہ یہی وہ دورِ کشاکش ہے جس میں حجۃ الاسلام ابوحامد الغزالی الشافعی پیدا ہوئے۔

عبدالرحیم الاسنوی اپنی تصنیف طبقات میں الغزالیؒ کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔ الغزالیؒ وہ امام ہیں جن کے نام نامی سے شرح صدر ہوتا ہے۔ اور جس سے روح میں بالیدگی ہوتی ہے جن کی تصانیف میں قلم کا مسافر خوشی سے باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اور صفحۂ قرطاس فرطِ مسرت سے جھومنے لگتا ہے جب اُن کو سنایا جاتا ہے تو آوازیں فرطِ ادب سے سکوت اختیار کر لیتی ہیں۔ اور سر جھک جاتے ہیں۔ وہ ۴۵۰ھ میں طوس میں پیدا ہوئے اُن کے والد ماجد اُون کاتا کرتے تھے۔ (یَغْزِلُ الصُّوْفَ) جس کے سبب وہ غزالی کہلائے۔ لیکن السمعانی کے نزدیک غزالی کی "ز" غیر مشدد ہے۔ کیونکہ اُن کے خیال میں الغزالی کی نسبت طوس کے قریب ایک گاؤں غزالہ کی طرف ہے۔ بسترِ مرگ پر اُن کے والد ماجد نے انہیں اور ان کے بھائی احمدؒ کو ایک پاک طینت صوفی کے زیر سایہ چھوڑا جس نے اُن کی تعلیم وتربیت کی یہاں تک کہ وہ روپیہ جو اُن کے والد محترم نے بطور ترکہ چھوڑا تھا سب کا سب ختم ہو گیا۔ چنانچہ اب غزالیؒ اور اُن کے بھائی کو فکر معاش دامنگیر ہوئی"۔

جس طرح آج کل ہمارے ہاں تعلیمی ادارے ہیں۔ جن میں تحصیل علم کے بعد ہمارے نوجوان کم و بیش سرکاری ملازمت اختیار کر کے اپنی معاش کا بندوبست کر لیتے ہیں، اسی طرح الغزالیؒ کے زمانے میں بڑے بڑے شہروں میں مدارس نظامیہ

قائم تھے۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور مدرسہ نظامیہ بغداد تھا جس کا سنگِ بنیاد اس وقت رکھا گیا تھا۔ جب الغزالیؒ سات برس کے تھے چنانچہ ان مدارس کے فارغ التحصیل طلباء آج کل کی طرح دنیوی جاہ و ثروت اور سرکاری ملازمت ہی اپنا مطح نظر قرار دیتے تھے۔ الغزالیؒ خود لکھتے ہیں " ہم پھر دونوں بھائی مدرسہ میں فقہ کی تعلیم پانے کے لئے گئے تاکہ روزی کما سکیں۔"

عبدالرحیم الاسنوی آگے چل کر لکھتا ہے کچھ عرصہ یہاں پڑھنے کے بعد وہ ابو ناصر الاسماعیلی کے پاس اور احمد ابوالمعالی الجرینی امام الحرمین کے پاس نیشاپور چلے گئے۔ جن کے تلمذ میں انہوں نے اس قدر محنت سے مطالعہ کیا کہ وہ اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ بالغ النظر ہو گئے اپنے استاد کی زندگی ہی میں وہ وہاں درس دیتے رہے اور کتابیں لکھتے رہے....

اپنے استاد کی وفات پر انہوں نے سلجوقی دربار کا قصد کیا اور اپنے آپ کو نظام الملک کی خدمت میں پیش کیا۔ نظام الملک بے حد علم دوست تھا۔ اور علماء کا مربّی اور قدردان چنانچہ اس کے دربار میں علماء اور فقہاء کا جم غفیر ہر وقت موجود رہتا تھا۔ الغزالی نے اُن کی مصاحبت میں بہت خوشی محسوس کی۔ اور اپنے مخالفین سے مباحثات کئے باوجود ان کے بلند پایہ علم و فضیلت کے ان سب کے دلائل کو رد کیا۔ اور اس طرح اپنی غیر معمولی استعداد کا سکّہ ان کے دلوں پر بٹھایا۔ الغزالی کی علمی صلاحیتوں نے بہت جلد نظام الملک کو اپنا گرویدہ کر لیا۔ نظام الملک نے ان کی بے حد قدر و منزلت کی اور ان کے نام کا شہرہ چار دانگ عالم میں پھیل گیا۔"

۴۸۴ھ میں انہیں نظامیۂ بغداد میں بطور پروفیسر مقرر کیا گیا۔ جہاں ان کا پر جوش استقبال کیا گیا نظامیہ یونیورسٹی میں الغزالی نے چار سال درس دیا۔ تمام بغداد اب اُن کے علم و فضل کے آگے سرِ نیاز خم کرتا تھا علماء و فقہاء دور دراز سے اُنہیں ملنے کے لئے آتے تھے۔ اور درباری رؤسا اُن کے مربّی و قدردان تھے۔ اسلامی دنیا میں ان کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔ اور اُنہیں "امام الخراسان" اور "امام العراق" کا اعزازی خطاب دیا گیا۔

الغزالی کے معاصرین ان کی بڑھتی ہوئی شہرت کی بناء پر ان سے حسد کرتے تھے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ وہ اپنی خدا داد ذہانت، بے مثال قوّتِ حافظہ، لاجواب ذکاوت، بے نظیر قوّت خطابت اور حیرت ناک قوّتِ عمل کے سبب ان سب پر سبقت لے گئے تھے۔ اور وہ یکتائے روزگار تھے۔ مگر باوجود اس تبحر علمی اور قدر و منزلت کے الغزالی کو سکون قلب حاصل نہیں تھا۔ اک بے پایاں عالم اور قادر الکلام خطیب ہونے کے باوجود ان کے معاصرین انہیں" مضطرب اور بے قرار" پاتے تھے ۴۸۸ھ میں اچانک ان کے خیالات میں اک زبردست انقلاب آیا ان کے اپنے الفاظ میں "ان پر خوف کا دروازہ کھل گیا جس نے انہیں ہر چیز سے باز رکھا اور اس امر پر مجبور کیا کہ وہ ماسوی اللہ ہر چیز سے کنارہ کشی کریں"

عبدالفاخران کا سوانح نگار اور ذاتی دوست ان کی اس ناگہانی قلب ماہیت کے بارے میں لکھتا ہے حماقت کی

خبیث روح جاہ و منصب کے حصول کی بے پناہ خواہش، شان و شوکت اور حیثیت کی محبت اور ناپسندیدہ اطوار کی جگہ اب تسکینِ قلب علوِ نفسی اور رسمی تکلفات سے نفرت نے لے لی تھی۔ انہوں نے درویشوں کا طریقہ اختیار کیا۔ اور لوگوں کو آخرت کے بارے میں ہدایت دینے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔

قدرتی طور پر اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امام غزالیؒ میں یہ فوری انقلاب کیوں کر رونما ہوا۔ سوانح نگاروں اور علماتے کئی اسباب بیان کئے ہیں۔ مگر سب سے مؤثق اور قابل قبول سبب جس کی تصدیق خود امام غزالیؒ کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ امام صاحب "علم و عقل" کے اس نقطۂ عروج پر پہنچ گئے تھے۔ جہاں سے آگے کوئی مقام نہیں۔ مگر اس کے باوجود حقیقت کو نہ پا سکے تھے۔ حقیقت کا تجسس انہیں ایک پل چین نہیں لینے دیتا تھا۔ باوجود اپنی ہمہ دانی اور کمال فضیلت کے وہ ابھی تک "ابن الکتاب" تھے ایک عرصہ تک وہ علم و عشق، اور "عقل و نظر" کی باہمی کشاکش کے سبب پریشان اور مضطرب رہے انھیں ایک زمانہ "تشکک" میں بسر کرنا پڑا جس کی دردناک اذیت سے تنگ آکر وہ گھبرا گھبرا اُٹھتے تھے ؎

خرد کی گتھیاں سُلجھا چکا ہوں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

ان جاں سوز ہیجانی کیفیات اور اس المناک دورِ کشمکش سے دوچار ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اوائل عمر ہی میں

الغزالیؒ حق کے متلاشی تھے۔ وہ موروثی عقائد اور روایات کو معقولیت کی کسوٹی پر پرکھنے کے بغیر کبھی تسلیم نہ کر سکتے تھے۔ اور یہ بات جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں "ان کے بس کی بات نہ تھی بلکہ ان کی فطرت اور مزاج میں ودیعت کی گئی تھی" چنانچہ اس جبلی ذوق تجسس کے ماتحت انہوں نے تمام مذاہب اور فلسفہ کا مطالعہ کیا۔ جس شخص سے بھی ملے اس کے مذہب اور عقائد کی خوبیوں سے آگاہ ہونا چاہا۔ مگر اب جب کہ انہوں نے حق و باطل سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنا چاہا تو اس کے لئے انہیں کوئی قابلِ وثوق معیار نہ مل سکا۔ زیادہ سے زیادہ اپنے حواس اور چند مقرر کردہ اصولوں ہی کی طرف رجوع کر سکتے تھے۔ مگر انہیں اپنے فراہم کردہ اصولوں اور اپنے حواس کے عجز کا فوراً ہی احساس ہو گیا آنکھیں ستاروں کو دیکھتی ہیں مگر انہیں سونے کے ٹکڑے سے بڑا نہیں سمجھتی ہیں۔ یہ صریحاً ایک فریب ہے۔ اور اگر آنکھیں اور دیگر حواس اس طرح فریب کھا سکتے ہیں تو ہمارے نفس کی حالت کیا ہوگی کیا ہی طرح وہ فریب نہیں کھا سکتا۔ شاید ہماری تمام زندگی ایک خواب ہے۔ جو موہوم تصورات پر مشتمل ہے۔ اور جن کو ہم غلطی سے حقائق کا نام دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں "تقریباً دو ماہ دل ہی دل میں اگرچہ برملا نہیں میں متشکک رہا" بالآخر حق تعالیٰ نے انہیں نورِ بصیرت سے نوازا۔ انہوں نے اپنی کھوئی ہوئی قوت دوبارہ حاصل کر لی۔ ان میں اب ایک توازن پیدا ہو گیا۔ جس کی مدد

سے اب وہ صحیح فکر و نظر کے قابل ہو گئے۔ چنانچہ اب انہوں نے اسلام کے ہر فرقہ اور ہر گروہ کے اعتقادات اور اصولوں کی چھان بین کی اور حق و باطل میں تمیز کرنے کے لئے انہیں اب ایک حقیقی معیار مل گیا تھا۔

فلسفیوں کے بارے میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ وہ راہ راست پر نہیں ہیں اور اسی بنا پر اپنی مشہور و معروف تصنیف "تہافتہ الفلاسفہ" لکھی۔ علم الکلام کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ "الحاد کے لئے تو وہ یقیناً بہترین مداوا ہے۔ مگر وہ اُسے اُس مرض سے شفا نہیں دے سکتا جس میں وہ مبتلا ہے" تصوّف اُن کی آخری اُمید تھی۔ انہوں نے صوفیوں کی تحریروں کو خوب غور سے پڑھا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ وہی سیدھی راہ پر ہیں ہاں مگر تصوف کے اعلیٰ مدارج بھی محض مطالعہ سے طے نہیں ہو سکتے بلکہ ان کو طے کرنے کے لئے بھی ذاتی مشاہدہ حال۔ وجد اور اخلاقی قلب ہئیت درکار ہے۔ چنانچہ انہوں نے بغداد کو خیر باد کہا۔ اور شام فلسطین اور مصر میں بحیثیت ایک درویش گھومتے رہے۔ ۴۸۶ھ میں وہ بغرض حج حجاز گئے۔ حج سے واپسی پر دمشق آئے۔ جہاں کی جامع مسجد کے ایک مینار میں بیٹھ کر انہوں نے کتنی ایک کتابیں تصنیف کیں جن میں شہرۂ آفاق احیاء علوم الدین بھی ہے بعدہٗ امام غزالیؒ اپنے وطن طوس کو چلے گئے۔ جہاں وہ ریاضت اور تصنیف و تالیف میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ وہ قرآن مجید کی تلاوت میں مداومت فرماتے تھے۔ اور تقریباً خلوت نشیں ہو گئے

تھے - اُن کے پرانے مربی و قدر دان نظام الملک کا صاحبزادہ فخر الملک انہیں ملنے کے لئے طوس آیا اور انہیں مجبور کیا کہ وہ نظامیہ بغداد میں جاکر بطور پروفیسر کام کریں۔ بالآخر وہ اس پر رضامند ہو گئے - مگر ان کی بلند بام روح اور خلوت پسند طبیعت کو بغداد کی فضا راس نہ آئی چنانچہ دو سال کے بعد وہ مستعفی ہو کر دوبارہ اپنے وطن طوس کو لوٹے جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے بقیہ ایام گذارے یہاں تک کہ وہ ۵۰۵ھ میں اس دار فانی سے رخصت ہو گئے - امام غزالیؒ کی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور تصنیف احیاء علوم الدین ہے - جس میں انہوں نے عبادات معاملات مہلکات منجیات پر ایک بسیط تبصرہ کیا ہے - نیز قرون وسطیٰ تک کے اسلامی فکر و نظر کا مکمل خلاصہ دیا ہے - احیاء کے بارے میں تیرھویں صدی کا مشہور عالم النووی لکھتا ہے - اگر مسلمانوں کی تمام تصانیف بھی ضائع کر دی جائیں - مگر احیاء کو باقی رکھا جائے تو یہ تمام نقصان کی تلافی کر دے گی - احیاء علوم الدین کے علاوہ ان کی مشہور تصانیف تہافۃ الفلاسفہ - فاتحۃ العلوم - منقذ من الضلال اور الاقتصاد فی الاعتقاد ہیں ان کتابوں نے اسلام میں از سر نو زندگی کی روح پھونکی۔ اور عقلی فکری اور نظری اعتبار سے اُسے نئے سرے تقویت دی امام غزالیؒ ہی اسلام میں وہ پہلے مصنف ہیں جنہوں نے اس بات کو واضح الفاظ میں پیش کیا - کہ تعلیم کا مقصد محض دینوی فوائد کا حصول نہیں بلکہ اس

کا اصلی جوہر یہ ہے کہ وہ انسان کے اخلاقی شعور میں بیداری اور توانائی پیدا کرے ان کی تعلیمات ہم مختصراً چار عنوانوں میں یوں بیان کر سکتے ہیں۔

(۱) انہوں نے اسلام کو متکلمین کی لفظی موشگافیوں اور پیچ درپیچ بحثوں سے نکال کر اس کی فقہ میں صحیح اسلامی روح ازسرِ نو پھونکی انہوں نے لوگوں کو براہِ راست کتاب و سنت پر عمل پیرا ہونے اور اُن سے تعلق جوڑنے کی تعلیم دی وہ اسلام کی طرف واپس پھرے اور اس کے بنیادی اصولوں اور تاریخی شواہد کو صحیح معنوں میں ہمارے سامنے رکھا۔

(۲) اپنے مذہبی اور اخلاقی وعظ و خطبات میں انہوں نے خوف کو اک ضروری درجہ دیا۔

(۳) مذہب میں انہوں نے ایک خاص فلسفۂ تصوّف پیش کیا۔ جس میں ذاتی تجربہ حال۔ وجد اور مراقبہ کو ضروری جزو قرار دیا۔

(۴) انہوں نے فلسفۂ مذہب کو اس خوش آئند پیرائے میں پیش کیا کہ اُسے ایک عامی انسان بھی نہایت آسانی سے سمجھ سکے۔

مختصر یہ کہ نہ صرف اسلام بلکہ عیسائیت اور صیہونیت کو سمجھنے کے لئے بھی امام غزالیؒ کی تصانیف چراغِ راہ ثابت ہوئیں۔ بارہویں صدی عیسوی سے پہلے اُن کی بہت سی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ اُن کی ایک تصنیف میزان العدل صیہونیوں میں

اس قدر مقبول ہوئی کہ انہوں نے اُسے عرانی زبان
میں منتقل کر لیا اور نہایت ہی شوق اور تندہی
سے اس کا مطالعہ کیا؟

واللہُ اعلمُ بالصّواب

سُلطان محمدؐ فاتح

قُسطنطنیہ ٹرکی کا بہت مشہور اور پُرانا شہر ہے جو آج سے دو ہزار چھ سو برس پہلے آباد کیا گیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے مسلمانوں کے متعلق فرمایا تھا کہ "تم قسطنطنیہ کو ضرور فتح کر لو گے۔ وہ فوج بھی خوب ہے اور اُس کا امیر بھی خوب ہے" بعد کے زمانہ میں حضور علیہ السّلام کے اس فرمان کو پورا کرنے کے لیئے مختلف اوقات میں بہت سے لوگوں نے کوششیں کیں۔ ہر شخص کو یہ شوق تھا کہ میرے ہاتھ سے رسول اللہؐ کی یہ پیشگوئی پوری ہو۔ اسی شوق میں مسلمان بہادر آٹھ سو برس تک برابر اس شہر کو فتح کرنے کی کوشش کرتے رہے اور اس عرصہ میں اُنھوں نے گیارہ حملے کیے۔ مگر شہر اتنا مضبوط اور محفوظ تھا کہ کوئی حملہ آور اُسے فتح نہ کر سکا۔ جس خوش نصیب انسان کے حصہ میں یہ سعادت آئی اُس کا نام محمدؐ تھا۔ اور وہ خاندانِ عثمانیہ کا آٹھواں بادشاہ تھا۔ اسی فتح کی وجہ سے تاریخ میں وہ "سلطان محمدؐ فاتح" کے نام

سے مشہور ہے۔

سلطان محمدؒ فاتح شاہ مراد ثانی کا لڑکا تھا۔ اور ۸۳۱ھ ہجری میں پیدا ہوا تھا۔ جب ۱۴ برس کا ہوا تو اس کا بڑا بھائی علاء الدین جو ولی عہد سلطنت تھا۔ بیمار ہوکر مر گیا۔ یہ شہزادہ بہت لائق۔ ہونہار اور بہادر تھا۔ باپ کو اس کی وفات کا سخت صدمہ ہوا۔ اُس نے محمدؒ کو تخت پر بٹھایا اور خود تنہائی کی زندگی اختیار کرلی۔ مگر اُس کے تخت سے علیحدہ ہوتے ہی آس پاس کی عیسائی سلطنتوں نے یہ سمجھ کر کہ محمدؒ صرف ۱۴ برس کا ناتجربہ کار بچّہ ہے۔ فساد و بغاوت اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔

اُس وقت قسطنطنیہ میں جو عیسائی بادشاہ تھا۔ اُس نے ان باغیوں کی بڑی حمایت کی۔ مجبور ہو کر مراد ثانی گوشۂ تنہائی سے باہر آیا۔ اور فوج لے کر سارے باغیوں کا قلع قمع کر دیا۔ اور بیٹے کو پھر تخت پر بٹھا دیا۔ مگر کچھ دن بعد دوبارہ پھر ان لوگوں نے فسادات شروع کیے۔ بیچارہ مراد پھر میدان میں آیا۔ اور فسادیوں کی خوب اچھی طرح گوشمالی کی۔ ۸۵۵ھ ہجری میں اُس کا انتقال ہو گیا۔ تو محمدؒ تیسری مرتبہ مستقل طور پر ٹرکی کا بادشاہ ہوا۔ اُس وقت اُس کی عمر ۲۴ برس کی تھی۔

محمدؒ آگے چل کر بہت کامیاب۔ بہادر اور اولالعزم سلطان ثابت ہوا۔ اور اُس نے عیسائیوں

چونکہ سلطان کی طاقت سے باہر تھا۔ اس لیے اُس نے بہت سوچ کر ایسی عجیب و غریب ہوشیاری اور بہادری سے کام لیا جسے دیکھ کر دنیا حیران ہو گئی۔ اور آج تک بھی اُس کے اس کارنامہ کا بیان بڑی حیرت سے کیا جاتا ہے۔

اُس نے یہ کام کیا کہ پاس کے جنگل سے ہزاروں درخت کٹوائے اور اُن کے بڑے بڑے تختے چِروا لیے۔ جب حسب ضرورت تختے تیار ہو گئے تو جس مقام پر اُس کی بحری فوج تھی وہاں سے اُس نے وہ تختے خشکی میں پہاڑی زمین پر بچھوانے شروع کیے۔ اور بہت پھیر کھا کر پانچ میل تک تختے بچھاتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ شہر کے بالکل دوسری طرف آبنائے تک اُس نے تختے بچھا دیئے۔

جب یہ کام مکمل ہو گیا تو اُس نے کئی ہزار من چربی تیار کروائی۔ اور پھر اُس چربی کا اُن تختوں پر بہت موٹا موٹا لیپ کر دیا۔ اس کام سے فراغت کے بعد سلطان نے اپنی اسّی عدد کشتیاں سمندر سے نکالیں اور لکڑی کی اس سڑک پر ڈال دیں۔ چربی کی وجہ سے وہ کشتیاں تختوں پر سے پھسلتی چلی گئیں اور فوج کے آدمی اُن کو پکڑ کر چلاتے رہے۔ پانچ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد فوج نے ان ۸۰ کشتیوں کو اُس

آبنائے میں لا ڈالا - جو قسطنطنیہ کی دیواروں کے نیچے تھی - اب یہ ایسا مقام تھا کہ راستہ تنگ ہونے کی وجہ سے کوئی بڑا جہاز اِدھر سے شاہ قسطنطنیہ کی مدد کو نہیں پہنچ سکتا تھا - چنانچہ اُدھر وہ جہاز بندرگاہ میں مجبوراً رُکے کھڑے رہے - اِدھر موقع سے فائدہ اُٹھا کر سلطان نے بڑے زور شور کے ساتھ شہر کی فصیل پر گولہ باری شروع کر دی - مگر فصیل اس قدر مضبوط بنی ہوئی تھی - کہ نہ کہیں سے گری اور نہ اُس میں کوئی سوراخ ہُوا - ایک ہزار سال سے یہ فصیل دشمنوں کا مقابلہ کر رہی تھی اور آج سے پہلے کوئی بھی حملہ آور اس فصیل کو توڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا -

باوجود مسلسل ناکامی کے سلطان نے ہمّت نہیں ہاری اور اُس نے پختہ ارادہ اِس بات کا کر لیا کہ یا تو رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کو پُورا کرتے ہوئے شہر کو فتح کروں گا - یا اپنی جان اسی راہ میں قربان کر دوں گا -

سلطان کی ہمّت - جرأت بہادری اور مستقل مزاجی پر بے اختیار آفریں کہنے کو دل چاہتا ہے کہ اگرچہ بظاہر کامیابی محال نظر آتی تھی - مگر قطعاً نہ گھبرایا اور مسلسل پچاس یوم تک فصیل پر گولے برساتا رہا - تب جا کر تین جگہ سے اُس

میں شگاف پڑ گئے - یہ دیکھتے ہی سلطان کی فوج کا سپہ سالار آغا حسن بڑی پھرتی کے ساتھ اپنے تیس ساتھیوں کے کمندیں لگا کر فصیل شہر پر چڑھ گیا - مگر فصیل پر جو فوج متعین تھی - اُس نے بڑی بہادری کے ساتھ اُن کی مزاحمت کی - آغا حسن خود مارا گیا - اُس کے اور ساتھی بھی کام آئے مگر باقی نے نیچے کود کر حیرت انگیز شجاعت کے ساتھ شہر کا دروازہ کھول دیا - اور سلطان اپنی فوج کے ساتھ شہر میں داخل ہو گیا - یہ دیکھ کر شہنشاہ قسطنطین نے جو سامنے کھڑا فوج کو لڑا رہا تھا - اپنا شاہی لباس اُتار کر پھینک دیا - تلوار ہاتھ میں لے کر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا اور لڑتے لڑتے بہادروں کی موت مارا گیا - شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا - اور سلطان نے ظہر کی نماز قسطنطنیہ کے سب سے بڑے گرجا "سینٹ صوفیہ" میں ادا کی -

فتح کے بعد سلطان نے عام منادی کرا دی کہ کوئی شخص نہ رعایا کو تکلیف دے نہ اُن کا مال چھینے - جو لوگ خوف سے شہر چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں واپس آ جائیں - اور اپنی جائداد اور مالوں پر قابض ہو جائیں - اُن کو مکمل آزادی دی جاتی ہے - کسی شخص کے مذہب میں قطعاً دخل اندازی نہیں کی جائے گی - نہ کسی پر مسلمان

ہونے کے لئے جبر کیا جائیگا۔ جو شخص کسی عیسائی یا یہودی کو ستائے گا اُسے سخت سزا دی جائے گی۔

سلطان خود عیسائی مذہب کا حامی بنا۔ اُس نے گنا دیوس نامی ایک عیسائی کو لاٹ پادری کا منصب عطا کیا۔ ایک بیش قیمت عصا اُسے مرحمت فرمایا۔ ایک قیمتی گھوڑا مع ساز و سامان دیا اور ایک ہزار اشرفیوں کا توڑا اُسے بخشا۔ نیز اُسے اس بات کی اجازت دی کہ پوری شان و شوکت کے ساتھ اپنا جلوس شہر میں نکالے۔ پھر نہایت مہربانی کرتے ہوئے اُسے عیسائیوں کے مقدّمات فیصلہ کرنے کے پورے اختیارات دیئے۔ غرض سلطان نے عیسائیوں سے نہایت ہمدردی اور رواداری کا سلوک کیا۔ اور اُن کو یہ بات بالکل محسوس نہ ہونے دی کہ وہ کسی غیر قوم کے محکوم ہیں۔ تعصّب اور طرف داری کا سلطان کے دل میں وہم بھی نہ تھا۔ اُس نے آخر وقت تک اپنی مسلمان اور عیسائی رعایا کے ساتھ یکساں سلوک کیا۔ بلکہ عیسائیوں کے ساتھ ہر موقع پر بہت نرمی کا برتاؤ کرتا رہا۔ جب قسطنطنیہ کی فتح کے بعد عیسائی فوجوں کا سپہ سالار ڈیوک نوٹا رداس گرفتار ہو کر اُس کے سامنے پیش کیا گیا۔ تو اُس نے نہ صرف اُسے معاف کردیا

بلکہ اُس کے ساتھ بڑی محبت کا سلوک کیا۔ اور بہت کچھ انعام و اکرام دے کر اُسے رُخصت کیا۔ اُس کی بیوی بیمار تھی۔ سلطان خود اُس کی مزاج پرسی کے لیئے اُس کے گھر گیا۔ اور ایسے احترام کے ساتھ اُس سے پیش آیا جیسے لڑکا اپنی ماں سے پیش آتا ہے۔ لیکن سپہ سالار نے ان احسانات کا یہ بدلہ دیا کہ اٹلی کے بادشاہ سے سازش کر کے سلطان کو جان سے مروا ڈالنا چاہا۔

سچ ہے دنیا میں نمک حراموں کی کمی نہیں۔

تیس برس تک نہایت شان و شوکت سے سلطنت کرنے کے بعد آخر اس نامور اور بہادر سلطان نے ۸۸۶ھ ہجری میں وفات پائی۔

حضرت مجدّد الفِ ثانی رح

مشرقی پنجاب میں ضلع انبالہ۔ ضلع کرنال۔ ریاست جیند۔ ضلع حصار ضلع فیروزپور۔ اور ضلع لدھیانہ سے گھری ہوئی سکھوں کی ایک مشہور ریاست پٹیالہ ہے۔ یہ ریاست پانچ ضلعوں میں بٹی ہوئی ہے۔ یعنی پٹیالہ۔ بسی۔ سنام۔ برنالہ اور نارنول۔ پٹیالہ میں ضلع کو نظامت کہتے ہیں۔ بسی کی نظامت میں ایک بہت مشہور و معروف قصبہ سرہند ہے۔ سلطان فیروز شاہ نے جو تغلق خاندان کا ایک بادشاہ گزرا ہے۔ اس کو آباد کیا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ گاؤں ترقی کرتا گیا۔ یہاں تک کہ مغل بادشاہوں کے زمانہ میں عظیم الشان شہر بن گیا۔ اتنا بڑا جتنا آج کل لاہور ہے۔ مغلوں کے زوال کے ساتھ ساتھ گھٹنا شروع ہوا۔ تو سکھ گردی میں ایک معمولی قصبہ رہ گیا۔ ارد گرد کئی کئی میل تک اس شہر کے کھنڈر اب بھی پائے جاتے ہیں۔ اور اس کے آس پاس جو گاؤں ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ وہ سرہند کے محلے تھے۔

اس قصبہ میں آج سے چار سو برس پہلے وہ عظیم الشان بزرگ پیدا ہوئے۔ جن کا نام احمد تھا۔ اور جو مسلمانوں میں "مجدد الفِ ثانی" کے نام سے مشہور ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ کہ میرے بعد اللہ تعالیٰ ہر سو سال کے بعد اُمت میں ایک ایسے آدمی کو کھڑا کیا کرے گا۔ جو

مسلمانوں میں پھیلے ہوئے غلط خیالات اور غلط اعتقادات کو دور کردیا کرے گا۔ آنحضورؐ کے اس ارشاد کے مطابق ہر صدی کے سر پر ایسے عُلماء ہوتے رہے۔ جو اُن مذہبی اور اخلاقی خرابیوں کو رفع کرتے رہے۔ جو اس عرصہ میں مسلمانوں میں رائج ہو گئی تھیں۔ اسلامی اصطلاح میں ایسے آدمی کو مجدد کہتے ہیں۔ مجدِّد کے معنی ہیں۔ دین کو دوبارہ قائم کرنے والا۔ اور دین میں پھیل جانے والی خرابیوں کو دُور کرنے والا۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کو ایک ہزار برس گزر چکے۔ اور دوسرا ہزار شروع ہو گیا۔ تو اُس وقت جو مجدّد پیدا ہوا۔ وہ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ تھے۔ اس لئے اُن کو مجدّد الفِ ثانی کہتے ہیں اس کے معنی ہیں۔ دوسرے ہزار کا مجدّد۔

حضرت مجدد الفِ ثانی رحمۃ اللہ علیہ ۱۴ شوال ۹۷۱ھ ہجری کو سرہند میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش سے ۷ سال پہلے اکبر بادشاہ اور ہیموں بقالی کے درمیان وہ خونریز اور فیصلہ کُن جنگ ہو چکی تھی۔ جو تاریخ میں پانی پت کی دوسری لڑائی کے نام سے مشہور ہے۔ آپ عادل خلیفہ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کی اولاد سے ہیں۔ آپ کے والد کا نام شیخ عبدالاحد تھا۔ جو بہت عالم فاضل اور بزرگ شخص تھے۔ انھوں نے بچے کا نام "احمد" رکھا۔ کسے پتہ تھا۔ کہ یہ بچہ بڑا ہو کر قوموں اور نسلوں کا فخر ثابت ہو گا۔ اور بڑے بڑے عالموں اور فاضلوں کی گردنیں اس کے آگے تعظیم کے لئے جھک جائیں گی۔

بہت ہی چھوٹی سی عمر میں حضرت نے قرآن کریم حفظ کر لیا۔ اس کے بعد باپ نے ان کو گھر ہی پر عربی اور فارسی کی تعلیم دینی شروع کی۔ حضرت احمد نہایت ذہین۔ ہونہار اور ہوشیار ثابت ہوئے۔ اور انھوں نے تھوڑے

ہی دنوں میں بہت اچھی لیاقت پیدا کرلی۔

اُس زمانہ میں پنجاب کا شہر سیالکوٹ علم کا مرکز بنا ہوا تھا بڑے بڑے عالم و فاضل۔ صوفی اور بزرگ یہاں موجود تھے۔ اور دور دور سے لوگ یہاں تحصیل علم کے لیے آتے۔ اور فارغ ہو کر واپس چلے جاتے۔ باپ نے حضرت احمد کو بھی سیالکوٹ بھیج دیا۔ لائق اور ہونہار طالب علم نے مرقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اور سیالکوٹ میں چوٹی کے علماء سے حدیث۔ تفسیر اور فقہ کی کتابیں پڑھیں۔ اور اس وقت جتنے علوم و فنون رائج تھے۔ سب میں کمال حاصل کیا۔ تحصیل علم سے فارغ ہو کر آپ آگرہ تشریف لے گئے۔ جو اس زمانہ میں ہندوستان کا دارالسلطنت تھا۔ یہاں تھوڑے ہی دنوں میں آپ کی علمی لیاقت کا سکہ سب کے دلوں پر بیٹھ گیا۔ اور عام لوگوں کے علاوہ شاہی دربار کے امراء بھی آپ کے علم کی بدولت آپ کی تعظیم کرنے لگے۔ آپ نے یہاں لوگوں کو تعلیم دینے اور تعلیم کی باتیں سکھانے کا سلسلہ شروع کیا۔ اور عرصہ تک طالب علموں کو علم کی دولت سے سیراب کرتے رہے۔ اس دوران میں سینکڑوں اشخاص نے آپ سے علمی فیض حاصل کیا۔ پھر آپ اپنے والد صاحب کی علالت کی وجہ سے سرہند تشریف لے گئے۔ اور اُنہی کی خدمت میں حاضر رہے۔ یہاں تک کہ ۱۰۰۷ھ ہجری میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

والد صاحب کے انتقال کے بعد آپ حج کے لیے گھر سے روانہ ہوئے۔ جب دہلی پہنچے۔ تو وہاں حضرت خواجہ باقی باللہ سے ملاقات ہوئی۔ جو ایک نہایت باخدا اور ولی کامل بزرگ تھے۔ اور سب سے الگ تھلگ شہر سے باہر ایک جھونپڑی میں رہا کرتے تھے۔ وہ بہت ہی کم لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے۔ اور دن رات خدا تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ لیکن جب انہوں نے حضرت احمد کو دیکھا۔ تو

خواہش ظاہر کی - کہ کچھ دنوں یہاں میرے پاس رہو - حضرت احمد کو بھی اُن کی پاک صحبت میں ایسا لطف آیا - کہ حج کا ارادہ ترک کیا - اُن کے مرید ہوئے اور یہیں رہ پڑے - دو سال تک آپ اُن کی خدمت میں رہ کر اُن سے روحانی فیض حاصل کرتے رہے ۔

اُس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی اور اخلاقی حالت بہت خراب ہو گئی تھی - لوگ نماز روزے کی پابندی سے عام طور پر آزاد ہو گئے تھے - فسق و فجور کی زیادتی ہو گئی تھی - غلط عقائد اور غلط خیالات بکثرت پھیل گئے تھے - بعض لوگ تو سرے سے خدا ہی کے منکر تھے - رسالت پر بھی طرح طرح کے اعتراضات کرنے لگے تھے - بے دینی زوروں پر تھی - اور دینداری عنقا ہو گئی تھی - لوگ خدا کو بھول چکے تھے - اور اس کے احکامات سے بالکل غافل ہو گئے تھے - عیش و عشرت میں بُری طرح مبتلا تھے - اور ہندوؤں کی رسومات اور عادتیں اکثر لوگوں نے اختیار کر لی تھیں ۔

جب حالت یہاں تک بگڑ گئی - تو اللہ تعالیٰ نے حسب وعدہ دینِ اسلام کی حفاظت کے لئے اور مسلمانوں کی اصلاح کے واسطے حضرت شیخ احمد سرہندی کو مقرر فرمایا - آپ نے ۱۰۰۰ھ ہجری میں مجدد ہونے کا دعویٰ کر دیا - اور فرمایا - کہ میں اُمت کی بھلائی اور بہتری کے لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیا گیا ہوں - لوگوں کو چاہیئے - کہ سارے بُرے کام چھوڑ کر نیک کام اختیار کریں - اور خدا اور رسُول کے پورے فرماں بردار بن جائیں -

جہاں اللہ تعالیٰ کا یہ قاعدہ ہے - کہ وہ ضرورت کے وقت اپنے کسی نیک بندے کو لوگوں کی اصلاح کے لئے بھیجا کرتا ہے - وہاں لوگوں کا بھی یہ قاعدہ ہے - کہ ایسے آدمی کی سخت مخالفت کرتے ہیں - اور

کوئی کسر اُس کی دشمنی میں اُٹھا نہیں رکھتے ۔ چونکہ عُلماء کی حالت بھی خراب ہو جاتی ہے ۔ اُور عام لوگوں کی بھی ۔ اس لئے یہ بات سوچنے کی کسی کو توفیق نہیں ہوتی ۔ کہ خدا کے بھیجے ہوئے آدمی کی مخالفت کرکے ہم کیسا بُرا کام کر رہے ہیں ؟ ایسے موقعوں پر عالموں اُور بڑے آدمیوں کو یہ خطرہ بھی ہوتا ہے ۔ کہ اب ہمیں کوئی نہ پوچھے گا ۔ اُور عام لوگ ہماری تعظیم و تکریم چھوڑ کر اس شخص کے پیچھے لگ جائیں گے ۔ اس لئے بھی عالم لوگ ایسے شخص کی مخالفت کیا کرتے ہیں ۔ اُور اپنے مریدوں سے بھی کرایا کرتے ہیں ۔ تاکہ کوئی شخص اللہ کے اُس نیک بندے کی طرف متوجّہ نہ ہو ۔ اُور اُس کی بات نہ سُنے ۔ اُور وہ علماء بدستور چودھری بنے بیٹھے رہیں ۔

یہاں بھی ایسا ہی ہوُا ۔ جب حضرت شیخ احمد سرہندی نے مجدّدِ الفِ ثانی ہونے کا دعویٰ کیا ۔ تو اس زمانہ کے بڑے بڑے عُلما آپ کے مخالف ہو گئے ۔ اُور عام لوگوں کو بھی آپ کے خلاف بھڑکایا ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوُا ۔ کہ مخالفت کا ایک طوفان آپ کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوُا ۔

شہنشاہ جلال الدین اکبر کا تو انتقال ہو چکا تھا ۔ اس کا بیٹا نورالدین جہانگیر اُس وقت بادشاہ تھا ۔ حاسد عُلماء نے اُس سے بھی آپ کے خلاف شکایتیں کیں ۔ اُور یہاں تک کہہ دیا ۔ اُور کہا ۔ کہ یہ شخص اسلام میں فتنہ پھیلا رہا ہے ۔ اُور حکومت پر قبضہ کیا چاہتا ہے ۔ جہانگیر نے حضرت مجدّدِ الفِ ثانی کو گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا ۔ آپ نے وہاں بھی راہِ حق بتانے کا کام جاری رکھا ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوُا ۔ کہ بہت قیدی شریعت کے پابند ہو گئے ۔ آخر بادشاہ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ۔ اُور اُس نے سمجھ لیا ۔ کہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں ۔ حضرت مجدّد بے گناہ ہیں اس پر اس نے اُن کو آزاد کر دیا ۔ اِن کا مرید ہو کر آخر عمر میں نماز روزے

کا پابند ہو گیا۔

قید سے چھوٹنے کے بعد حضرت مجدد نے تمام ملک کا ایک دورہ فرمایا اور ہر جگہ لوگوں کو نیک بننے اور بُرے کاموں کو چھوڑ دینے۔ خدا و رسولؐ کی اطاعت کرنے اور نماز و روزہ ادا کرنے کی تاکید کی۔ جس کے نتیجہ میں ہزاروں لوگوں نے آپ کا کہنا مان کر بُرے کام چھوڑ دیئے۔ اور نیک اور دیندار آدمی بن گئے۔

۲۸ یا ۲۹ صفر ۱۰۳۴ھ ہجری کو ۶۳ سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کا مزار آج بھی سرہند میں موجود ہے۔ جس پر ہر سال بڑی دھوم دھام سے عُرس ہوتا ہے۔ اور دُور دُور سے لوگ زیارت کو آتے ہیں۔ آپ کے فارسی مکتوبات پند و نصائح کا مرقع ہیں۔

چاند بی بی

چاند بی بی احمد نگر کے سلطان کی بیٹی تھی، جو بیجاپور کے والی علی عادل شاہ کے ساتھ بیاہی گئی تھی۔ چاند بی بی کو قدرت کی طرف سے بہترین دل و دماغ اور بے نظیر جوہر عطا ہوئے تھے۔ وہ ایک نازک اور خوبصورت جسم والی پردہ نشین خاتون تھی اور حد سے زیادہ حسین اور قبول صورت تھی۔

چاند بی بی جنگ کے فن میں پوری طرح ماہر اور صلح اور امن قائم کرنے میں یکتا تھی۔ وہ ایک پختہ کار گھوڑے سوار تھی، جب کبھی اُس کا شوہر لشکر کی خاطر یا کسی مہم کی طرف روانہ ہوتا، تو چاند بی بی ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتی۔ اُسے موسیقی میں بھی بہت بڑا کمال حاصل تھا۔

وہ عربی، فارسی، ترکی اور مرہٹی زبانوں میں نہایت بے تکلفی سے گفتگو کیا کرتی تھی پھولوں کی نقش و نگاری اُس کا محبوب مشغلہ تھا۔

علی عادل شاہ کو اپنی بیوی پر پورا اعتماد تھا۔

۱۵۸۰ء میں جب علی عادل شاہ نے اس دُنیا سے کوچ کیا، تو چاند بی بی بیوہ ہو جانے کے بعد احمد نگر واپس آ گئی، اور اپنے شوہر کے نابالغ بھتیجے ابراہیم عادل شاہ کی سرپرست بن گئی، جو اپنے والد کے بعد تخت کا وارث مقرر ہوا تھا۔ چاند بی بی اپنی گوناگوں خوبیوں کے باعث اپنی رعایا میں ہر دل عزیز بن گئی تھی۔ مگر تھوڑے عرصے کے بعد اُس کی سلطنت کے بعض وزیروں نے چاند بی بی کے ساتھ حسد کرنا شروع کر دیا، جس سے سلطنت میں بے اطمینانی اور بغاوت پھیل گئی۔ لہذا چاند بی بی "ستارا" کی طرف بھاگنے پر مجبور ہو گئی۔ کوئی زیادہ عرصہ گذرنے نہ پایا تھا کہ اُن وزیروں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی، اور اُن میں سے ہر ایک تخت پر بیٹھنے کا خواہش مند تھا۔ اس صورتِ حال نے نوجوان بادشاہ کے ہاتھ مضبوط کر دیئے، اور اُس نے اپنے اختیارات برتنا شروع کر دیئے چنانچہ چاند بی بی کو نہایت عزّت اور احترام سے واپس بُلا لیا گیا۔ اور وہ بدستور اپنی سلطنت کے کاروبار میں مشغول ہو گئی۔

ایک روز جب چاند بی بی اپنے شاہی محل میں اپنی خاص سہیلیوں کے درمیان بیٹھی ہوئی باتوں میں مصروف تھی، کہ اچانک گھوڑوں کے

ٹاپوں کی کھڑ کھڑاہٹ سُنائی دی تمام عورتیں فوراً اُٹھ کھڑی ہوئیں اور چاند بی بی سے رُخصت ہو گئیں۔ اس کے فوراً بعد ایک ملازم چاند بی بی کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ اطلاع دی کہ احمد نگر سے ایک سفیر چند شہ سواروں کے ساتھ آیا ہے اور آپ سے ملنا چاہتا ہے چاند بی بی نے پہلے تو اپنے بیٹے عباس کو بُلا بھیجا اور پھر سفیر کو طلب کیا۔ سفیر نے یوں عرض کیا؛

"احمد نگر اس وقت ایک نہایت نازک دور سے گزر رہا ہے۔ اور ایسے خطرناک حالات میں آپ ایسے رہنما کی ضرورت ہے۔ جو ہمیں اس تباہی اور مصیبت سے نجات دلائے۔" چاند بی بی چونکہ اپنے ملک کی سچی خیر خواہ اور ہمدرد تھی۔ اس لئے وہ فوراً اپنے چیدہ چیدہ اور بہترین سپاہیوں، اپنے بیٹے عباس اور اُن کی بیوی زُہرہ کو ساتھ لے کر بیجاپور سے احمد نگر کی طرف روانہ ہو گئی۔ احمد نگر کے لوگوں نے چاند بی بی کا شاندار استقبال کیا۔ چاند بی بی نے اپنے حُسن سلوک اور بلند رُتبہ کی وجہ سے رعایا کے دلوں کو مسخر کر لیا۔ چاند بی بی نے تمام حالات پر بہت جلد قابو پا لیا۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کے فوجیوں نے بھی

اپنی خدمات پیش کر دیں، اور اُن پہاڑوں کی حفاظت کا ذمہ اٹھایا، جو احمد نگر کے شمال کی طرف واقع تھے۔ شہزادہ کو بھی لوگوں کی متفقہ رائے کے ساتھ تخت پر بٹھا دیا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد قلعہ کے ظالم گورنر کے اکسانے سے اکبر بادشاہ کے بیٹے شہزادہ مُراد نے ۱۵۹۵ء میں احمد نگر پر حملہ کر دیا۔ چاند بی بی بھی مکمل تیاری کے ساتھ مقابلے پر ڈٹ گئی۔ تمام امیر اور وزیر جو تخت حاصل کرنے کی خاطر ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے تھے، اپنے اختلافات کو چھوڑ کر سب چاند بی بی کی حمایت میں اکٹھے ہو گئے۔ قلعہ تک جانے والی تمام سڑکیں مُغل فوجی سپاہیوں سے بھری پڑی تھیں۔ دشمن کی فوجیں آہستہ آہستہ بڑھتی گئیں۔ یہاں تک کہ اُنھوں نے تمام اطراف سے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اب باہر سے کسی قسم کی کمک، کا بھیجنا ناممکن تھا۔ مغل سپاہی سُرنگیں اور خندقیں کھودتے ہوئے، اور قلعہ کی دیواروں میں شگاف کرنے کے لیے، توپ خانے نصب کرتے ہوئے برابر آگے کی طرف بڑھتے گئے۔ ادھر چاند بی بی جو مورچہ بندی کے فن میں حد سے زیادہ تجربہ کار اور ماہر تھی، احمد نگر میں خود فوج کی کمان کر رہی تھی۔ اُس نے مغلوں کے

تمام منصوبے جو انہوں نے قلعہ کو فتح کرنے کے لئے سوچ ہوئے تھے، خاک میں ملا دئے۔ اگر مغل اپنے توپ خانوں سے قلعہ کی فصیلوں میں رخنے پیدا کرتے، تو چاند بی بی فوراً اپنے بہادر سپاہیوں کے ذریعے اُن کی مرمّت کرا دیتی۔

ایک دفعہ رات کے وقت جب چاند بی بی اپنے ساتھیوں کے ساتھ قلعہ کی دیواروں پر کھڑی تھی، تو ایک خندق سے غائبانہ آواز آئی۔ آواز کے الفاظ یہ تھے۔ "اے بہادر شہزادی! تم نے اپنے ملک اور قوم کے مفاد کی خاطر بہت اچھی طرح جدّ و جہد کی ہے، اب تمہارے لئے بہتر یہی ہے۔ کہ تم ہتھیار ڈالدو تاکہ ملک قتل و غارت اور خونریزی سے بچ جائے۔ تمہارے پاؤں کے نیچے بارود سے بھری ہوئی پانچ سرنگیں بچھی ہوئی ہیں، یہ تمہارے قلعہ کی دیواروں کو فوراً اُڑا دیں گی۔ اس بروقت اطلاع سے فائدہ اٹھاؤ، اور لڑائی کو بند کردو" یہ سُن کر بہت سے لوگوں نے بھی چاند بی بی کو ہتھیار ڈالنے کا مشورہ دیا۔ مگر چاند بی بی نے اُنہیں یہ جواب دیا، "اگرچہ میں عورت ہوں؛ مگر میں اس مقام کی حفاظت اُس وقت تک کروں گی، جب تک

میرے جسم میں جان ہے۔ خدا میری مدد کرے گا۔ میں اس زمین کو اپنی کمزور انگلیوں سے پھاڑ ڈالوں گی، اور لڑائی بند کرنے کے بجائے اس خطرے کو بھی ختم کر دوں گی"۔ چاند بی بی کے ان الفاظ نے قلعے کی حفاظت کرنے والے سپاہیوں کے حوصلے بڑھا دیئے۔ وہ سب کے سب یک زبان ہو کر بولے۔ "اے اماں! ہم تمہارا آخری وقت تک ساتھ دیں گے۔ اگر خدا نے چاہا، تو ہم مرنا قبول کریں گے، مگر اپنے آپ کو دشمن کے حوالے ہرگز نہیں کریں گے"۔

چاند بی بی نے اپنے ہاتھ میں کلہاڑی پکڑی، اور مزدوروں کے ایک گروہ کو اپنے ساتھ لے کر سرنگوں کے پاس پہنچ گئی۔ وہاں لوگوں نے ساری رات کام کیا، صبح ہونے سے پہلے پہلے چار سرنگیں کھود ڈالی گئیں۔ اور ان کو ناکارہ اور بیکار بنا دیا گیا۔ مغلوں نے پورا ایک مہینہ لگا کر یہ کام مکمل کیا تھا، جسے چاند بی بی نے صرف ایک رات کے اندر اندر درہم برہم کر دیا۔ لیکن بدقسمتی سے ایک سرنگ باقی رہ گئی تھی، جس کا چاند بی بی اور اس کے ساتھیوں کو پتہ نہ لگ سکا۔ شہزادہ مراد موقع پر پہنچا، اور اسی سرنگ کو آگ لگانے کے احکام جاری کر دیئے۔ سرنگ کے پھٹنے سے ایک بہت

بڑا دھماکا ہوا - اور قلعہ کی فصیل میں ایک رخنہ پیدا ہو گیا - چاند بی بی نے خود زرہ بکتر پہن لیا۔ اور اُس "رخنہ" کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی - بس پھر کیا تھا، احمد نگر کے سپاہیوں میں ایک نئی زندگی اور جان پیدا ہو گئی - مغلوں نے بہت زبردست گولہ باری کی، مگر چاند بی بی کی فوج ایسی بہادری اور بے جگری سے لڑی کہ مغلوں کے چھکے چھوٹ گئے - شہزادہ مراد کو حد سے زیادہ ندامت ہوئی، کہ اُس نے ایک عورت کے ہاتھوں شکست کھائی - چنانچہ مغلوں نے ہتھیار ڈال دیئے، اور شہزادہ مراد صلح کرنے پر مجبور ہو گیا - اب احمد نگر میں بالکل امن دامان کا دور دورہ تھا - مگر یہ امن عارضی ثابت ہوا، کیونکہ خود غرض وزیروں میں ایک دوسرے کے خلاف بغض وحسد کی آگ پھر بھڑک اُٹھی - اور دوبارہ خانہ جنگی شروع ہو گئی - اکبر بادشاہ نے اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے، اپنے بیٹے شہزادہ دانیال کو احمد نگر پر قبضہ کرنے کے لئے روانہ کر دیا - چاند بی بی نے پھر مغلوں کے مقابلے کی تیاری کی، لیکن اب اس کے ارادوں میں وہ دم خم نہ تھا -

کیونکہ اُس کی فوج کے سپاہی کافی تعداد میں مارے جا چکے تھے - لہذا چاند بی بی کی کامیابی

کے امکانات اس دفعہ بہت کم رہ گئے تھے۔ قلعہ کی فوج کی باگ ڈور حمید خاں کے ہاتھ میں تھی۔ حمید خاں شہزادہ عباس کو نفرت کی نظروں سے دیکھتا تھا اور اس بنا پر اُس کی ماں یعنی چاند بی بی کی جان کا بھی لاگو بن گیا۔ چاند بی بی کو حمید خاں پر پورا بھروسہ تھا اور وہ اس سے قطعاً بے خبر تھی کہ حمید خاں کی نیت بدل گئی ہے۔ مغلوں کی فوجیں یورش کرتی ہوئی احمد نگر کی دیواروں تک آپہنچیں۔ عباس نے چاند بی بی کو احمد نگر چھوڑنے کا مشورہ دیا، مگر اُس نے انکار کر دیا۔ چونکہ چاند بی بی کو اس موقع پہ اپنی کامیابی کی کوئی اُمید نہ تھی، اس لئے وہ اپنے آدمیوں کو قتل و غارت اور تباہی سے بچانے کی تجویزیں سوچ رہی تھی۔ آخر چاند بی بی کو ایک تجویز سوجھی اُس نے اُس نے حمید خاں کو بلایا اور کہا۔ "اس دفعہ احمد نگر میں تفرقہ بازی کا زور ہو رہا ہے۔ بہت سے آدمیوں نے بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا ہے۔ اب مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جس پر میں اعتماد کر سکوں یہ کہہ کر چاند بی بی نے ایک عہد نامہ نکالا اور کہا۔" میں نے شہزادہ دانیال سے درخواست کی ہے۔ کہ وہ میرے آدمیوں کو صحیح و سالم قلعہ سے نکل جانے کی

اجازت دے دے۔ تو میں قلعہ کو اُس کے حوالے کر دوں گی۔ یہی ایک تجویز مجھے سوجھی ہے۔ جس سے ناجائز اور بے جا خونریزی سے بچاؤ ہو جائے گا۔ اگر اس وقت ہم لڑائی کے لئے نکلیں، تو ہمیں شکست ہوگی۔ اس قدر جانوں کو بے فائدہ ضائع کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ بتاؤ، اس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟"

چور کی ڈاڑھی میں تنکا۔ حمید خاں کو یہ شبہ ہوا کہ چاند بی بی کو اُس کی نیتِ بد کا پتہ چل گیا ہے۔

اُس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ مگر اُس نے اپنی ندامت کو چھپانے کی بے انتہا کوشش کی۔ حمید خاں چاند بی بی کے ہاتھ سے عہد نامہ کا کاغذ لے کر محل سے نکل بھاگا۔ اور اپنے سپاہیوں کو یہ کہہ کر اُکسایا کہ چاند بی بی قلعہ کو دشمن کے حوالے کرنا چاہتی ہے۔ اب اُسے زندہ نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ چنانچہ تمام سپاہی حمید خاں کے ساتھ "غدار ہی غدار ہی" کا نعرہ لگاتے ہوئے چاند بی بی کے محل کی طرف چل دیئے۔ ملکہ نے خیال کیا کہ دشمن آن پہنچا ہے۔ مگر یہ معلوم کر کے کہ حمید خاں نے اُس کے ساتھ "غداری" کی ہے۔ چاند بی بی کے غم و غصہ کی کوئی انتہا نہ ہوئی۔ اگرچہ اب چاند بی بی کو اپنی موت کا

یقین ہو چکا تھا، مگر پھر بھی وہ سیدھی اور خاموش کھڑی ہو گئی، حمید خاں نے اپنی تلوار سے چاند بی بی پر وحشیانہ حملہ کیا، جس سے وہ زخمی ہو کر دھڑام سے زمین پر گر پڑی - زُہرہ عباس کی بیوی شور سُن کر دوڑی اور یہ درد ناک نظارہ دیکھ کر سہم کر رہ گئی - زہرہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے - وہ چاند بی بی کے ہونٹوں تک پانی کا پیالہ لے گئی - لیکن ملکہ نے اُسے ایک طرف ہٹا دیا - اور نہایت بہادرانہ لہجہ میں بولی - "خُدا کو ایسا ہی منظور تھا - اور اُس کی مرضی کے مطابق مجھے ضرور اس دنیا سے کوچ کرنا ہے" اس کے فوراً بعد چاند بی بی کی روح اپنے جسم سے پرواز کر گئی -

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن - چاند بی بی کا نام بہادری، صداقت اور استقلال میں ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے زندہ رہے گا -

نورجہاں

ہندوستان کے اسلامی دورِ سلطنت میں جہاں بلبن، علاءالدین، اکبر اور اورنگ زیب جیسی شاندار ہستیاں ہماری خاکِ وطن سے اُبھری ہیں وہاں اس ملک نے خواتین کے حلقہ میں بھی نورجہاں زیب النساء، اور چاند بی بی جیسی بلند مرتبہ شخصیتیں پیش کی ہیں اسلامی عہد کے نسوانی طبقہ میں سب سے نمایاں تاریخی حیثیت نورجہاں کو حاصل ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اُس کو مغل شاہی مذاق رومان کی زندہ جاوید یادگار بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ خود محبت بھی تھی اور خالق محبت بھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ نہ صرف ایک مجسمۂ حسن وجمال تھی بلکہ اُس فہم و فراست کی مالک بھی تھی جس کی قوت پر وہ شاہی اقتدار تک پہنچی اور پندرہ سولہ سال تک زمامِ سلطنت ایسے انتہائی شعور کے ساتھ سنبھالے رہی کہ کسی کو احساس بھی نہ ہونے دیا کہ حکومت غیر جنس کے ہاتھ میں ہے۔

بچپن میں تاریخ کی جو کتابیں ہماری درس گاہوں میں پڑھائی جاتی ہیں ان میں نورجہاں کے واقعہ کو ایک ایسی رومانی جھلک دے کر پیش کیا جاتا ہے جسے پڑھ کر نورجہاں کے نرم و نازک بیضوی چہرے۔ کشادہ پیشانی، کشیدہ آنکھوں اور پتلے پتلے ہونٹوں میں جہانگیر کے ذوقِ نظر کی صورت

صاف جھلکنے لگتی ہے۔ نور جہاں سے میری دلچسپی بھی ایسی ہی کتابوں کی ممنون ہے۔ میں نے بھی اس کی تصویر کے پردے میں عشوہ و ناز کی تمام دلکشیاں اور جہانگیر کے دل کی تمام دھڑکنیں محسوس کی تھیں۔ لیکن تاریخی شعور بیدار ہونے کے بعد میں نے اُس کے خد و خال سے رعنائی کے بجائے عظمت، نزاکت کے بجائے جرأت و ہمت اور دل کشی کے بجائے فراست ٹپکتی ہوئی دیکھی ہے یوں کہنے کو تو وہ غریب ماں باپ کی بیٹی تھی۔ لیکن نسبی وجاہت اور خاندانی عظمت اس کے بزرگوں میں نسلاً بعد نسل چلی آتی تھی۔ اُس کے دادا خواجہ محمد شریف شاہ طہماسپ کے عہد میں یزد کے وزیر تھے۔ جنہوں نے ۱۵۷۷ء میں انتقال کیا۔ اُن کی وفات کے بعد سے خاندان کا عارضی زوال شروع ہو گیا بالآخر ان کے صاحب زادے غیاث الدین محمد کو تلاش روزگار میں ترک وطن کرنا پڑا۔ اور وہ اپنے دو صاحبزادوں، ایک صاحبزادی اور ایک حاملہ بیوی کو لے کر ایک کاروان کے ہمراہ جس کی سالاری ملک مسعود کے ذمے تھی ہندوستان کے لئے روانہ ہوئے ان دنوں ایران سے ہندوستان کا سفر کچھ آسان نہ تھا اس لئے۔ نصف راستہ تک پہنچتے پہنچتے غیاث بیگ کے تمام ذرائع سفر مفقود ہو گئے۔ اور ان کا تمام سامان رہزنوں کی نذر ہو گیا صرف دو گھوڑے باقی تھے۔ جن کی امداد سے اُنھوں نے بہزار دقّت و پریشانی قندھار پکڑا اسی سرزمین میں نور جہاں (مہرالنساء) پیدا ہوئی ملک مسعود

کو چونکہ اس سفر میں غیاث بیگ سے بڑی خصوصیت پیدا ہو گئی تھی اس لئے وہ ہر ضرورت میں ان کا کفیل رہا تاریخ کی یہ روایت کہ نورجہاں کو اُس کے والدین نے ایک ناقابل برداشت بوجھ سمجھ کر راستہ میں پھینک دیا تھا۔ سراسر غلط ہے۔ ان بے سرو پا قصوں کی تعمیر میں اُن گندی ذہنیتوں کا ہاتھ شامل رہا ہے جو نورجہاں کی طرف سے متعصب تھیں اور اس کی عظمت کو ایسے ڈھکوسلوں سے داغدار بنانا چاہتی تھیں بہرحال ایرانی مسافروں کا یہ قافلہ لاہور سے گزر کر فتح پور سیکری پہنچا جہاں ملک مسعود نے اپنے دوست غیاث بیگ کو اکبر کے روبرو اس دعویٰ کے ساتھ پیش کیا کہ اس مرتبہ میں اپنے ساتھ کوئی بیش بہا گوہر نہیں لا سکا ہوں اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ایک ایسا انسانی گوہر حضور میں پیش کرتا ہوں جو شاہی نظر انتخاب کے قابل ہوگا۔

غیاث الدین کی علمیت، ذہانت، تہذیب، طرزِ انشاء اور لطف تکلم خود اس دعوے کی صداقت پر شاہد تھا۔ چنانچہ وہ اپنی صلاحیتوں کے سہارے پر ترقی کرتے ہوئے دیوان کابل کے باعزت مرتبہ تک پہنچ گیا۔

اس عرصہ میں مہرالنساء بڑھتی اور نوجوان ہوتی رہی حتیٰ کہ وہ سترہ سال کی عمر میں ایک ایسی حسین وجمیل خاتون تھی جس کے حسن و جمال کا کم از کم مشرق میں کوئی جواب نہ تھا علی قلی استاجلو جس سے مہرالنساء منسوب ہوئی تھی کبھی شاہ اسماعیل ثانی کے دربار سے وابستہ تھا۔ لیکن اپنے آقا کی وفات

کے بعد کچھ دن سرگرداں رہ کر ملتان پہنچ گیا تھا یہاں اس نے عبدالرحیم خان خاناں کی معیت میں ٹھٹھ کی مہم میں اپنی شجاعت و مردانگی کے وہ جوہر دکھائے کہ خان خاناں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے بالآخر لاہور کی واپسی پر انہوں نے علی قلی کا تعارف اعلیٰ طبقہ سے کرا دیا جس سے اس کی شہرت وکمالات کو چار چاند لگ گئے میواڑ کی ایک مہم کے زمانہ میں جب کہ علی قلی ۱۵۹۹ء میں شہزادہ سلیم کے ہمرکاب تھا اُسے شیر افگن کا خطاب عنایت ہوا تھا اپنی تخت نشینی کے کچھ عرصہ بعد جہانگیر نے اُسے بردوان کی جاگیر عطا کر دی تھی جہاں مہرالنسا بھی اس کے ہمراہ رہتی تھی۔ مہرالنساء کے آغاز شباب میں سلیم کی دلچسپی کے واقعات معاصرانہ شہادتوں سے محروم ہیں معتمد خاندان کا نگار حسین اور عبدالحمید لاہوری وغیرہ تمام مورخین اس ذیل میں خاموش ہیں ممکن ہے شاہی رُعب و داب اس فقدان کا باعث ہوا ہو لیکن ایک صدی بعد کے مورخین ان واقعات کی پرزور حمایت کرتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض مثلاً صادق تبریزی خانی خان اور سوجن رائے وغیرہ تو یہاں تک پہنچتے ہیں کہ قطب الدین کو بنگال کی گورنری پر متعین بھی اس مقصد سے کیا گیا تھا کہ کسی نہ کسی صورت سے مہرالنساء کو حاصل کر کے شاہی جذبات کی تسکین کرے اتفاق سے اس وقت بنگال کی حالت بڑی پرآشوب تھی۔ ہر طرف غیر مطمئن پٹھان جمع تھے۔ خفیہ طور پر دوانیوں کا زور اور بغاوتوں کا شور تھا۔ شیر افگن بھی کچھ ایسے ہی شکوک کی

زد میں آ گیا۔ ۳۰ر مارچ ۱۶۰۷ء کو قطب الدین (گورنر بنگال)
نے حسب الحکم شاہی اُسے گرفتاری کی نیت سے طلب
کیا۔ وہ حاضر ہوا تو فریقین کے غم و غصہ نے ردو بدل
کی صورت اختیار کر لی۔ جس کے نتیجہ کے طور پر قطب الدین
اور شیر افگن دونوں کی زندگی کا باب ختم ہوگیا اب مہر النساء
اپنی یتیم بچی (لاڈلی بیگم) کے ساتھ دربار بھیج دی گئی۔ جہاں
وہ سلطان سلیمہ بیگم کی خدمت میں مامور ہوئی اس وقت اس
کا سن تیئیس ۲۳ سال تھا اور وہ حسن شباب کی تمام رنگینیوں
سے آراستہ تھی۔ لیکن چار سال تک کوئی نمایاں رومانی
تحریک جانبین سے نظر نہیں آئی اس فقدان کی وجہ بعض
مورخین یہ بتاتے ہیں کہ جہانگیر اپنے بھائی قطب الدین کے
قتل کی وجہ سے مہر النساء سے ناراض رہا۔ بعض کا
خیال ہے کہ خود مہر النساء شوہر کی وفات کے باعث
برہم رہی اور شاہی پیغام محبت کا جواب انکار سے دیتی
رہی۔ کچھ یہ بھی کہتے ہیں کہ جہانگیر اس کے حسن و جمال
سے واقف ہی نہ تھا۔ مہر النساء سے اس کا پہلا تعارف
۱۶۱۱ء میں جشن بہار کے ایک مینا بازار میں ہوا۔ جس
کے کچھ عرصہ بعد دونوں کی شادی ہوگئی اور مہر النساء
نورجہاں کا اعزاز پا کر اک نئی شان سے جلوہ گر ہوئی
بہر حال اصلیت جو کچھ بھی ہو، نورجہاں کا دور بیوگی رومانی
تصورات کے لئے دلچسپ ضرور ہے۔ شادی کے بعد
سے جہانگیر اور مہر النساء دونوں کی زندگی کا اک نیا
باب شروع ہوتا ہے۔ ایک طرف جہانگیر تن آسانی کی

طرف مائل ہے۔ اور وہ روز بروز منظر عام سے ہٹتا جا رہا ہے۔ دوسری طرف نورجہاں ہے کہ روز بروز زیادہ ذکی و فہیم اور باخبر ہوتی جا رہی ہے۔ اُس کا اقتدار رفتہ رفتہ اس مرکز پر آ رہا ہے جہاں پہنچ کر وہ خود شاہی افسروں کو احکام صادر کرے گی، شاہی فرمان اس کے نام سے ان الفاظ میں زینت پائیں گے ؎

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور
بنام نور جہاں بادشاہ بیگم زر

حتیٰ کہ خود جہاں پناہ فرمائیں گے کہ نورجہاں میں حکومت کی تمام تر صلاحیتیں موجود ہیں اس لئے مجھے تو صرف اک ساغرِ مے اور چند کباب درکار ہیں۔

عقد ثانی کے بعد نورجہاں کی زندگی[2] کو واضح طور پر تین حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے پہلا حصہ ۱۶۱۱ء سے ۱۶۱۷ء تک جب کہ اس کا اقتدار رفتہ رفتہ عروج پر آ رہا تھا لیکن انتظام سلطنت ابھی جہانگیر ہی کے ہاتھ میں تھا۔ اس زمانہ میں نورجہاں کی حیثیت ایک شریک زندگی اور معینِ حکومت سے زیادہ نہ تھی اور اس کے تعلقات شہزادۂ خرم کے ساتھ رفیقانہ تھے۔ دوسرا عہد ۱۶۱۷ء سے ۱۶۲۲ء تک جب کہ جہانگیر عملی طور پر منظر عام سے ہٹ چکا تھا اور نورجہاں حکومت کے سیاہ و سفید کی مالک تھی۔ اب ملکہ اور خرم ایک دوسرے کے درپئے آزار تھے۔ آخری دور ۱۶۲۲ء سے ۱۶۲۷ء تک نورجہاں کے انحطاطِ عمر اور زوال اقتدار کا عہد ہے۔ جب کہ جہانگیر

کی وفات کے کچھ عرصہ بعد وہ دنیا کے ہنگاموں سے دور ہو کر شکست خوردہ حریف کی حیثیت سے زندگی گزارنے لگی نور جہاں کی زندگی کا مذکورہ درمیانی دور سب سے زیادہ قابل ذکر ہے۔ کیونکہ اسی زمانہ میں وہ اپنی سیاست اور حکمت عملی کے انتہائی عروج پر تھی۔ یوں کہنے کو تو جہانگیر کی علالت کا سلسلہ ۱۶۱۱ء ہی سے شروع ہو گیا تھا لیکن چار پانچ سال تک اس کی صحت سنبھلی رہی اور وہ حکومت کے کار و بار دیکھتا بھالتا رہا بالآخر ۱۶۱۳ء میں اس کی تندرستی نے جواب دے دیا۔ اور اُسے مشاغل سلطنت سے دست بردار ہو جانا پڑا۔ اب نور جہاں کو اپنی صلاحیتیں آزماتے اور اپنی انتظامی خصوصیات کو بروئے کار لانے کا موقع ملا یہی وہ وقت ہے جب کہ نور جہاں فکرِ اقتدار کے ساتھ ساتھ آئندہ خطرات کی پیش بندیوں میں الجھی رہی۔ اس کا سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ جہانگیر کی مسلسل علالت کوئی اعتبار حیات نہ رکھتی تھی برخلاف اس کے نور جہاں کی جسمانی اور دماغی قوتیں یہ توقع دلاتی تھیں کہ اُسے جہانگیر کے بعد ایک طویل مدت زندہ رہنا ہوگا۔۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ اگر جہانگیر کے بعد بساطِ حکومت اس کی مرضی کے مطابق منقلب نہ ہوئی تو اس کا تمام اقتدار خواب و خیال ہو کر رہ جائے گا۔ اُسے پرویز یا خرّم کی تخت نشینی کے امکانات جب واضح طور پر نظر آتے تھے تو خود اس کے دلولے متزلزل ہو

جاتے تھے۔ وہ ایک نیام میں دو تلواریں اور ایک مملکت میں دو فرماں رواؤں کا تصور نہیں کر سکتی تھی اس لئے اُس نے فیصلہ کیا کہ یا تو جہانگیر کے بعد مجھے دنیاوی کاروبار سے علیحدگی اختیار کرکے گوشہ نشینی کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔ یا پھر اپنے اقتدار کو مستقل و پائدار بنانے کے لئے جان لڑا دینی چاہئے یہ آخری شکل بڑی مشکل ہے۔ لیکن نور جہاں کی بلند ہمتی نے اسی کو پسند کیا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ خسرو، پرویز و خرم سب کی تخت نشینی کے امکانات مٹا کر اپنے داماد شہریار کے لئے راستہ صاف کر دے کیونکہ شہریار کی تخت نشینی کی صورت میں وہی سلطنت کے سیاہ و سفید کی مالک رہے گی۔ اس سیاسی منصوبے کو ذہن میں رکھ کر وہ کوئی اقدام کرنا ہی چاہتی تھی کہ ۱۶۲۱ء میں خرم کو دکن میں کامیابی نصیب ہوئی۔ اور بالکل اسی زمانہ میں اُسے جہانگیر کے شدید طور پر بیمار ہو جانے کی اطلاع بھی ملی اس نے حکومت کے لالچ میں اپنے بڑے بھائی خُسرو کو جو شہزادگان میں تنہا حکومت کے لائق تھا برہان پور میں مروا ڈالا اور کچھ روز اس کی موت کو چھپا کر جہانگیر سے دردِ قولنج کا بہانہ کر دیا۔ اس طرح نور جہاں کی ایک مُشکل خود بخود آسان ہو گئی اب دوسرا زبردست خطرہ خُرم کا تھا چنانچہ اس سے کشمکش شروع ہوئی۔ قندھار مغلیہ حکومت کا جزو تھا جس پر ایرانیوں

نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس کی واپسی بہر طور ضروری تھی۔ نورجہاں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر یہ اسکیم مرتب کی کہ وہ قندھار کی مہم کے لئے خرم کا نام تجویز کرے۔ اگر خرم کسی طرح سے وہاں جانے پر راضی ہو جائے۔ تو اس کی عدم موجودگی میں اس کا درباری اثر آسانی سے زائل کیا جا سکے گا۔ اور اس کے طرف داروں کو توڑ کر شہر یار کے امکانات میں اضافہ ہو سکے گا۔ لیکن اگر اس نے جانے سے انکار کیا تو شاہی عتاب اس کی نافرمانی کا جواب دے کر خود بخود راستہ سے ہٹا دے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا خرم نے روانگی سے انکار کیا اور جہانگیر اس کے متعلق ایک مخالف رائے قائم کرنے پر مجبور ہوا۔ اب شہر یار کے منصب میں اضافہ کر کے اُسے قندھار کی خدمت تفویض ہوئی اس موقعہ پر نورجہاں کی فراست نے وہ صورت پیدا کر دی تھی کہ اگر جہانگیر کی صحت ذرا بھی وقفہ دیتی تو وہ شہریار کی ولی عہدی کا اعلان کرا دیتی۔ ابھی زمانہ میں ایک دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ خُرم نے دھول پور کا پرگنہ جاگیر کے طور پر عطا ہونے کی درخواست کی اور منظوری کی توقع کرتے ہوئے دریا خاں کو وہاں کا کام سنبھالنے کے لئے بھیج دیا لیکن دوسری سمت نورجہاں نے بھی یہی پرگنہ شہریار کے لئے حاصل کر کے شریف الملک کو اس کا مختار بنا کر روانہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں عہدہ داروں میں جنگ ہوئی اور شریف زخمی ہوا۔ نورجہاں نے پھر موقع سے فائدہ اٹھایا اور

جہانگیر کو یقین دلا دیا کہ خرم کسی رُو رعایت اور ہمدردی و انعام کا مستحق نہیں ہے۔ جہانگیر نے اس کے جواب میں شہریار کے مراتب میں اور اضافہ کر دیا اور خرم کی وہ جاگیر جو شمالی ہند میں تھی شہریار کے نام منتقل کر کے خرم سے کہا کہ وہ اتنی آمدنی کی جاگیر جنوب میں پسند کرے۔ خرم نے بادشاہ کی برہمی کو محسوس کرتے ہوئے اپنے معتمد افضل خاں کو خط دے کر دربار روانہ کیا۔ اس خط میں نورجہاں کی مطلق العنانی پر طنز کرتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی گئی تھی۔ لیکن بادشاہ کی برہمی نے افضل خاں کو باریابی کی عزت نہ بخشی چنانچہ اس نے مانڈو واپس آکر خرم کو اشتعال دیا اور یہ محسوس کرایا کہ اس کی بقا صرف فوجی اقدام ہی میں ممکن ہے۔ خرم نے یہ سوچ کر جب اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو نورجہاں کی مخالفت میں دکن کے بہت سے امیروں کو اپنا ہم نوا پایا۔ کئی راجپوت حکمراں بھی اس کے ہمدرد تھے، دربار میں آصف خاں اور فیروز جنگ (عبید اللہ خان) خود اس کے آدمی تھے۔ اور وہ معتمد خاں اور فدائی خاں پر بھی اعتماد کر سکتا تھا۔ بہر حال اپنی قوت کے بل پر خرم مانڈو سے اس ارادہ کے ساتھ روانہ ہوا۔ کہ حکمراں اور حکومت کے نمائندوں کو بغیر اطلاع کے گرفتار کرے۔ نورجہاں کی فراست نے بالکل متوازی وقت پر اس مخالفانہ اقدام کا احساس کر لیا اس نے سب سے پہلے مہابت خاں کے شکوک و شکایات رفع کر کے افغانستان سے طلب کیا اور اس کے مراتب میں اضافہ کر کے کل

فوج کا اختیار دے دیا۔ پھر شہزادہ پرویز کو فوری پیغام بھیج کر بہار سے طلب کر لیا بعض راجپوت امراء مثلاً مارواڑ کوٹہ اور بوندی وغیرہ کے حکمرانوں کی امداد حاصل کی بہت سے عتاب زدہ امراء کی خطائیں معاف کر کے اپنے میں شامل کر لیا خود جہانگیر بھی اپنی علالت کے باوجود لاہور سے دہلی پہنچ گیا۔ خرم اپنی ستائیس ہزار فوج کی معیت میں جمنا پر آ گیا۔ ادھر سے شاہی فوج جو چھبیس ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ مہابت خاں آصف خاں اور عبداللہ خاں کی ماتحتی میں آگے بڑھی شاہی فوج کا کم و بیش ایک تہائی حصہ عبداللہ خاں کی دھوکہ بازی کی وجہ سے خرم سے جا ملا۔ لیکن اس کے باوجود اس کو شکست ہوئی اور خرم نے بھاگ کر مانڈو کے قلعہ میں پناہ لی وہ اپنی قوت کو فراہم کر کے دوبارہ پھر مقابلہ میں آیا لیکن مہابت خاں اور پرویز نے اُسے پھر شکست دی اس مرتبہ وہ گولکنڈہ چلا گیا اور ملک عنبر کی امداد لے کر پھر مقابل ہوا۔ لیکن اسے بنگال، بہار، برہان پور ہر جگہ سے شکست ہوئی۔ اس کے تمام ساتھی جن کی معیت میں وہ دہلی کی سمت بڑھا تھا یا مر چکے تھے۔ یا ساتھ چھوڑ بیٹھے تھے۔ فیروز جنگ (عبداللہ خاں) جو شاہی فوج کو دھوکہ دے کر اُدھر جا ملا تھا۔ تارک الدنیا ہو چکا تھا خود اس کی تندرستی بھی خراب ہو گئی تھی۔ مختصر یہ کہ خُرم کو اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا بالآخر اس نے غیر مشروط فرماں برداری کی درخواست کی۔

نور جہاں اپنے مخالفین کی طاقتوں میں اعتدال برقرار رکھنا چاہتی تھی اس نے محسوس کیا کہ خانہ جنگی کے دوران میں مہابت خاں اور پرویز میں ایک خاص رشتہ پیدا ہو گیا ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ اور اپنی قوت کے زعم میں نئے خواب دیکھنے چاہتے ہیں تو ضرورت اس بات کی تھی کہ خُرّم کو ذرا سا سہارا دے کر دونوں فریق کی سطح ہموار کر دی جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ نور جہاں نے خرم کی تمام خطائیں معاف کر دیں اور اس کی درخواست پر بادشاہ کی طرف سے خود یہ جواب لکھا کہ رہتاس اور اثیر کے قلعے شاہی افسروں کے حوالے کر دو۔ اپنے دونوں بچوں (دارا شکوہ اور اورنگ زیب) کو دربار بھیج دو تمہاری خطا معاف کر دی جائے گی۔ اور بالا گھاٹ کی جاگیر واپس دے دی جائے گی۔ خرم نے تعمیل ارشاد میں اپنے دونوں بچوں کو تحفہ تحائف دے کر لاہور بھیج دیا اور وہ خود اپنی بیوی کے ساتھ ناسک چلا گیا۔ اس طرح تین سال کی طویل خانہ جنگی نور جہاں کی فتح یابی پر ختم ہوئی۔ دوران جنگ میں کمانڈر انچیف کی حیثیت سے متعین ہونے پر مہابت خاں کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی اس لئے وہ اپنے تجربہ اور قوت کے بل پر پرویز کے لئے راستہ صاف کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی اس آرزو سے نور جہاں بے خبر نہ تھی۔ اس نے عین وقت پر ان خطرات کو محسوس کر لیا اور پیش بندی کا فیصلہ کیا خرم کے مقابلہ میں نور جہاں کی سیاسی فتح کچھ معمولی کامیابی نہ تھی۔ اس لئے اس کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ اور وہ مہابت خاں

کو نظر میں لانے والی نہ تھی چنانچہ اس نے بڑی ہمت و فراست سے اپنے دشمنوں کا دوسرا سیاسی اشتراک توڑنے کے لئے قدم اٹھایا اور مہابت خاں کو پرویز سے علیحدہ کرنے کے خیال سے بنگال کا گورنر مقرر کر دیا۔ پرویز نے اپنی شکست قوت کا احساس کرتے ہوئے حکم عدولی کرنی چاہی اور مہابت خاں کو چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ لیکن اس نافرمانی کے جواب میں نورجہاں کے ایک ہی تہدید آمیز خط نے تمام ولولے مٹا دیئے اور مہابت خاں بنگال جانے پر مجبور ہوا۔ مہابت خاں کی قوت توڑنے کے سلسلہ میں نورجہاں کا دوسرا اقدام یہ تھا کہ وہ حکومت اور رعایا دونوں کی نگاہوں میں اس کا کردار آئینہ کر دے۔ اسی خیال کو لئے ہوئے اس نے مہابت سے ان تمام ہاتھیوں کا مطالبہ کیا جو خرم کی بغاوت کے دوران میں بنگال اور بہار سے ہاتھ آئے تھے۔ اس نے بعض ضبط شدہ جاگیروں کی آمد و خرچ کی حساب فہمی کے لئے بھی سرکاری گماشتہ مہابت خاں کے پاس بھیجا۔ اور اسے تاکید کر دی کہ اگر حسابات تسلی بخش نہ دیئے جائیں تو مہابت خاں کو دربار میں بھیج دیا جائے مہابت خاں نے دونوں احکام کی تعمیل سے گریز کیا اور اس کا جواب دینے کے لئے وہ چار پانچ ہزار راجپوتوں کی معیّت میں دربار کی طرف روانہ ہوا۔ یہ وہ وقت تھا کہ جہانگیر کابل کے سفر میں دریائے جہلم کے کنارے پڑا ہوا تھا۔ مہابت خاں کے آنے کے تھوڑی ہی

دیر بعد شاہی دربار کے ارکین سپاہی، ملازم خانگی سامان ہتھیار اور خزانہ وغیرہ سب دریا کے پار ہونے لگے اور صرف جہانگیر، معتمد خاں، میر منصور، شاہی محلات، کچھ خانگی ملازم اور چند خواجہ سرا جنہیں اگلے روز سفر کرنا تھا۔ اس طرف باقی رہ گئے۔ اب مہابت خاں نے جرأت کر کے بادشاہ کو گرفتار کرنا چاہا اس نے سب سے پہلے دو ہزار سپاہیوں کو پل پر متعین کر دیا تاکہ وہ دوسری طرف سے کسی امداد کو نہ آنے دیں خود ایک جمعیت ساتھ لے کر جہانگیر کو گرفتار کرنے کے لئے بڑھا۔ اس خواب و خیال میں بھی نہ آنے والی بے عزتی کو دیکھ کر جہانگیر نے بہت پیچ و تاب کھایا اور کئی مرتبہ تلوار کے قبضہ پر ہاتھ ڈالا مگر مجبور ہو ہو کر رہ گیا۔ اس ہنگامہ کے نتائج پر غور کر کے نورجہاں نے لباس تبدیل کیا۔ اور جواہر خاں خواجہ سرا کو لے کر عام مسافروں کی بھیڑ میں پل سے گزر گئی۔ اس نے آصف خاں کے پاس پہنچ کر تمام افسروں کو لعنت ملامت کی اور پھر ارکین سلطنت کو مشورہ کے لئے جمع کر کے حملہ کی تیاری شروع کی دریا کی تیز دھار کو عبور کر کے باخبر فوج پر حملہ کرنا خصوصیت کے ساتھ ایسے وقت میں جب کہ اپنا محبوب بادشاہ دشمن کی قید میں ہو آسان نہ تھا۔ اس لئے متعدد کوششوں کے باوجود نورجہاں کو ناکام رہنا پڑا بالآخر اس نے ظاہرا طور پر اپنی شکست کا اعتراف کر کے خود کو مہابت خاں کے سپرد کر دیا لیکن اس کے

ذہن میں دماغی جنگ کا ایک نقشہ مرتب تھا۔ جسے وہ بروئے کار لانا چاہتی تھی۔ جہانگیر کی گرفتاری سے مہابت خاں کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں ہوسکتا تھا کہ بادشاہ کو اپنی نگرانی میں رکھے وہ سب کچھ کرتا رہے۔ جو پندرہ سال سے اس کے مخالفین نورجہاں کی محبت کی بدولت کرتے رہے تھے اس لئے اس نے بادشاہ کے پروگرام میں کسی قسم کی تبدیلی کی گنجائش نہ محسوس کی۔ چنانچہ کابل کا سفر اب بھی برقرار رہا۔ دریائے سندھ اُتر کر اٹک کے مقام پر آصف خاں اور اس کا لڑکا شائستہ خاں گرفتار کر لئے گئے۔ اب مہابت خاں کی قوّت کچھ اور مستحکم ہو گئی۔ تمام مملکت میں کوئی اس کا مقابل مدِ نظر نہ آتا تھا۔ لیکن راجپوتوں کے بڑھتے ہوئے اثر نے مسلمان سرداروں میں برا فروختگی پیدا کر دی تھی۔ اور امرائے سلطنت اس کے غیر مستحق اقتدار سے رفتہ رفتہ متعصب ہوئے جا رہے تھے۔ نورجہاں کی فراست ایسے ہی موقع کی منتظر تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی تحریک شروع کی نورجہاں کو ایک وقت دو متضاد کام کرنے تھے۔ ایک اس کا فرض تھا کہ اپنی تحریکات سے مہابت خاں کو مشکوک ہونے دے اور دوسری طرف اُمرائے سلطنت کو برانگیختہ کر کے اپنی سمت ملاتی رہے اس نے پہلا کام اپنے شریکِ حیات سے لیا۔ اور دوسری خدمت خود اپنے

ذریعے رکھی وہ ایک طرف جہانگیر کے ذریعہ سے مہابت
خاں کو یہ جتا رہی تھی کہ بادشاہ نور جہاں اور آصف
خاں دونوں سے متنفر اور اپنی موجودہ حالت پر
مطمئن ہیں وہ خوش ہوا کہ انہیں اپنے ایک باوفا ملازم
کے ہاتھوں حکومت کے ان ناپسندیدہ عناصر (نور جہاں
اور آصف خاں) سے نجات مل گئی۔ بادشاہ نے
مہابت خاں کو یقین دلانے کے لئے نور جہاں اور
آصف خاں کی بہت سی مفروضہ کمزوریاں بھی بیان
کیں۔ جہانگیر کے کلمات پر اعتماد کر کے مہابت خاں
اپنی تمام خبر گیریوں کے باوجود فریب کھا گیا اس
نے نگرانی کرنے والی راجپوت گارڈ کی تعداد بھی
کم کر دی اور بادشاہ کی نقل و حرکت سیر و شکار اور
فقیر و فقراء کی ملاقات سب پر سے پابندیاں ہٹا لیں دوسری
طرف نور جہاں مہابت خاں کے مخالف امراء کو مشتعل
کر کے ایک سلسلہ میں جوڑتی رہی اُس نے بہت
غیر مطمئن امراء کی شکایات رفع کر کے انہیں اطمینان
دلا دیا۔ لالچی سرداروں کو رشوتیں دے کر اپنا
لیا۔ سینکڑوں معمولی آدمیوں کو اپنی طرف داری کا
تمغہ دے کر اُن کی ہمدردیاں حاصل کر لیں اور
اس طرح ایک زبردست جال بچھا کر مہابت خاں
کے سامنے ڈال دیا۔ چند ہفتوں کی سیر و گشت کے
بعد جب وہاں سے واپسی ہوئی تو مہابت خاں جہانگیر
کی طرف سے پوری طرح مطمئن اور نور جہاں کے

مشاغل سے بالکل بے خبر تھا۔ بہ اطمینان بخش صورت دیکھ کر نورجہاں نے اپنی تحریک کو اور زیادہ وسعت دے دی اب اس کے طرف داروں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ اور اس کے بہت سے خفیہ معتمدین بادشاہ کی محافظ گارد میں تعینات تھے۔ اُس نے اپنے خواجہ سرا ہوشیار خاں کو لاہور بھیج کر دو ہزار سپاہیوں کے بلانے کا انتظام کر لیا۔ جب کابل سے واپسی پر سب لوگ رہتاس سے ایک دن کی مسافت پر تھے۔ تو آخری بار ٹ کھیلا گیا۔ اور جہانگیر نے فوج کا اختیار سنبھال کر اپنی آزادی کا اعلان کر دیا مہابت خاں کو مفرور ہو کر میواڑ کی پہاڑیوں میں پناہ لینی پڑی خرم کو جہانگیر کی گرفتاری کا علم مارچ ۱۶۲۶ء میں ہوا جب کہ وہ احمد نگر میں مقیم تھا اس نے فوراً اپنے مستقبل کو نگاہ میں رکھ کر بادشاہ کے رہا کرانے کی تیاری شروع کر دی لیکن اُسے اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہو سکی۔ اسی اثنا میں مہابت خاں نورجہاں کی فراست سے مات کھا کر بھاگا اس کا بائیس لاکھ کا خزانہ جو بنگال سے اس کی امداد کے لئے آ رہا تھا۔ شاہی افسروں نے چھین لیا۔ وہ خود میواڑ کی پہاڑیوں میں روپوش تھا۔ اور شاہی فوج اس کے تعاقب میں تھی اکتوبر ۱۶۲۶ء میں اس کا حامی پرویز انتقال کر چکا تھا اس لئے اس نے مجبور ہو کر خرم سے ملازمت میں لئے جانے کی

درخواست کی جو مصلحتاً منظور کر لی گئی اب دو زبردست حریف پھر مشترک ہو کر نور جہاں کے مدِ مقابل آ گئے۔ نور جہاں نے خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے اس نئے اشتراک کو دبانے کے لئے خانِ جہاں کو کمانڈر انچیف مقرر کیا لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد جہانگیر کا سلسلۂ حیات ختم ہو گیا اور فوراً ہی وراثت کا سوال پیدا ہو گیا۔ نور جہاں نے امرائے دربار کی ایک کانفرس طلب کر لی۔ لیکن آصف خاں چونکہ خرم کا طرف دار تھا اس لئے وہ حائل رہا۔ اس نے کشمیر میں نور جہاں کی نقل و حرکت بند کر کے خرم کو دکن سے طلب کیا اور درمیانی عرصہ کے لئے داور بخش کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا نور جہاں نے اپنی پابندیوں کے باوجود شہریار کو پیغام بھیجا کہ وہ فوج جمع کر کے جلد اُس تک پہنچ جائے شہر یار نے لاہور میں اپنی تخت نشینی کا اعلان کر کے شاہی خزانے کا ستر لاکھ روپیہ امرائے ریاست کو اپنی سمت ملانے اور فوج فراہم کرنے پر صرف کر دیا۔ لیکن اُسے داور بخش کی فوج نے شکست دی اور گرفتار کر کے اندھا کر دیا گیا۔ خرم یہ اطلاعات پا کر دکن سے روانہ ہوا اس نے آصف خاں کو فرمان بھیج کر تاکید کی کہ میرے پہنچنے سے قبل داور بخش شہریار اور شہزادہ دانیال کے تمام لڑکوں کو قتل کرا کے میری بادشاہت کا

اعلان کرا دیا جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اپنے اقتدار کے خاتمہ پر نور جہاں اپنی بیوہ لڑکی کے ہمراہ لاہور رہنے لگی اس نے دو لاکھ پنشن پر گزارہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اب وہ سفید لباس پہنے اور نشاط و سرور کی محفلوں سے دور رہ کر احساس الم میں مبتلا رہنے لگی۔ شوہر کی وفات کے مکمل اٹھارہ سال بعد اس نے ۱۹ شوال ۱۰۵۵ھ میں انتقال کیا اور شاہدرہ میں جہانگیر کے نزدیک اپنے تعمیر کردہ مقبرہ میں مدفون ہوئی۔ قدرت کی فیاضی نے نور جہاں کو وہ تمام دولتیں عطا کی تھیں جو ایک غیر معمولی انسان کا حصّہ ہوتی رہیں۔ حسن و جمال کے علاوہ وہ تندرستی کی نعمت نیز فکر، اعلیٰ ذہن اور ہمہ گیر مزاج سے بھی آراستہ تھی۔ اعلیٰ تعلیم و تربیت نے اس کے ان جوہروں کو اور آب و تاب دے دی تھی۔ وہ ایک بلند پایہ شاعرہ ہونے کے ساتھ فارسی ادب کا ایسا ستھرا ذوق رکھتی تھی کہ جس نے جہانگیر کی نگاہ میں اُسے عزیز تر بنا دیا تھا۔ عمدہ جمالیاتی ذوق کے علاوہ وہ شہسواری کے فن کی بھی ماہر تھی اور سیر و شکار کے وقت اس کے نشانے کی سچائی کا اندازہ ہوتا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس میں وہ تمام خوبیاں بھی موجود تھیں جو ایک اعلیٰ خاتون کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ نور جہاں کی جدتِ طبع کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب جنوری ۱۶۱۳ء

میں سلطان سلیمہ بیگم کے انتقال پر اُسے بادشاہ بیگم ہونے کا موقعہ ملا تو اس نے خرم انداز رہائش میں ایک انقلاب برپا کر دیا لباس کی آرائش و زیبائش میں اضافہ کیا۔ زیورات میں ایجادیں اور تیاری طعام کے نئے اسلوب پیدا کیئے وہ بڑی نیک دل عورت تھی اور اس کا گھر یتیموں اور محتاجوں کی اُمید گاہ تھا۔ اس نے ہزاروں یتیم اور لاوارث بچیوں کی شادیاں کرائیں اور اُن کے مصارف خود برداشت کیئے وہ تمام عمر ان جذبات و احساسات کی حامل رہی جو ایک پرشوکت زندگی کے لئے ضروری ہوتے ہیں اس نے اپنے فیض التفات سے اکثر خاک کو لاکھ کو خاک بنایا ہے وہ جب خرم سے خوش ہوئی تو شہزادگی کی تمام شان و شوکت سے آراستہ کر دیا۔ اور جب ناراض ہوئی تو خاک میں ملا کر رکھ دیا۔ وہ جب تک صاحب اختیار رہی اس نے ہر چیز پر حکومت کی اور جب اس کا اقتدار ختم ہوا تو زندگی کے تحرکات سے دامن کش ہو کر اس نے مذہبی تصورات اور راہبانہ جمود کو پسند کر لیا وہ مقام پر اقتدار حاصل کر سکتی تھی اور نا محسوس طور پر اس اقتدار کو بڑھا سکتی تھی۔ وہ اپنی ان تھک محنتوں میں ایک سکون و سرور محسوس کر لیتی تھی۔ اور ہر مرحلہ کی تہہ تک پہنچ جاتی تھی اس کے مخالفین کو اعتراف ہے کہ وہ ہر مشکل کو چھو کر آسان کر دیتی تھی

فہم و فراست میں اس کا ملک بھر میں جواب نہ تھا - اور وہ بصیرت میں ہمت و محنت شامل کر کے تقدیروں کو متزلزل کر دیتی تھی - اس کی سیاست نے خسرو، پرویز، خرم اور شہر یار سب کو امید و بیم کے دوراہے پر بھٹکائے رکھا - وہ حاضر جوابی اور حاضر دماغی دونوں تھی - اور خطرات میں ایک صحیح راستہ تلاش کر لیتی تھی ایک بگڑے ہوئے ہاتھی کی پشت پر دریا کے تند و تیز دھارے میں جب کہ ہر طرف سے تیروں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی وہ اپنے اوسان نہ کھو سکی اور مہابت خاں جیسے تجربہ کار سیاست داں کی قید میں آ کر بھی وہ اپنا اعتدال دماغی بر قرار رکھ سکی مختصر یہ کہ بے حد حسین اور محبوب دل کش اور فیشن ایبل، با ذوق اور باوفا سخی اور فہیم تھی جہانگیر نے جب اسے اپنا شریک حیات بنایا تھا تو دونوں ایک دوسرے سے بہت سی خصوصیات میں مختلف تھے اس لئے دونوں نے ایک دوسرے کی کمزوریاں پوری کر کے ایک شان دار زندگی پیدا کر دی بالآخر جہانگیر کو اس سے اتنی محبت ہو گئی یا اس پر اتنا اعتماد ہو گیا - کہ جب حکومت نور جہاں کے ہاتھوں میں گئی تو اُسے ذرا بھی احساس نہ تھا - نور جہاں نے جہانگیر کے مزاج کا اتنا قریبی مطالعہ کیا تھا - کہ وہ اس کے ہر شعوری اور غیر شعوری

رُجحان سے واقف تھی اسی لئے کبھی اس نے جہانگیر کو بد دل نہ ہونے دیا اور طویل علالتوں میں بھی اُس کی کلفتوں سے دور رکھنے میں کامیاب رہی اس نے وفاداری اور شوہر پرستی کے تمام آئین پورے کئے اور دائم المریض جہانگیر سے کبھی بے خبر نہ رہی اس نے اپنے دوران حکومت میں بھی کبھی جہانگیر کے کسی اصول کو مجروح نہ ہونے دیا۔ اسی لئے جہانگیر کو کبھی یہ احساس پیدا نہ ہو سکا کہ حکومت اس کے ہاتھ سے نکل کر ان دلربا ہاتھوں میں کیوں گئی جن کو وہ محبوب رکھتا ہے۔

یا جو خود جہانگیر کو محبوب رکھتے ہیں؟

والله تعالیٰ اعلم بالصواب

اورنگ زیب عالمگیر رح

ہندوستان میں مُغل سلطنت کے بانی بابر بادشاہ کی کہانی تم حِصّہ اوّل میں پڑھ چکے ہو - اُس کے بیٹے پوتوں نے کوئی تین سو سال ہندوستان پر حکومت کی - جن میں سے پہلے چھ بادشاہ بہت نامور اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر گزرے ہیں - ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب عالمگیر شاہ غازی جو ان چھ میں سب سے آخر ہوا ہے - اپنے بزرگوں کی تمام خوبیوں کا مرقع معلوم ہوتا ہے - یہ بے مثال تاجدار اپنے دادا جہانگیر کے عہد میں شہزادہ خُرّم (جو بعد میں شاہجہاں کے لقب سے بادشاہ ہُوا) کے ہاں ممتاز محل کے بطن سے ۱۰۲۷ھ ہجری میں پیدا ہُوا - اُس سے دو بڑے بھائی داراشکوہ اور شجاع اور سب سے بڑی شہزادی جہان آرا بیگم بھی اسی نامور ملکہ کے بطن سے تھے -

اس کی تعلیم و تربیت بچپن ہی سے نہایت

محتاط و دیندار لوگوں کے ہاتھوں میں ہوئی۔ چونکہ شاہجہاں خود اسلامی شریعت کا پابند اور دیندار بادشاہ تھا۔ اور چاہتا تھا کہ شاہزادے بھی دیندار ہوں۔ اِس لیئے اُس کے اتالیق نے شروع ہی سے اِس بات کا خیال رکھا کہ شاہزادہ عربی۔ فارسی اور ترکی زبانوں کے ساتھ ساتھ دینی علوم کا عالم اور ایک باعمل مسلمان ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اُسے شاہانہ عیش پسندیوں سے نفرت ہوتی گئی اور صحابہ کرام رضؓ کی سی سی زندگی بسر کرنے کا خیال بڑھتا گیا۔ چنانچہ جب وہ جوان ہوًا تو اُس کی قرآنی زندگی کو دوسرے بھائی حاسدانہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

شجاعت جو تیموری نسل کا خاص جوہر ہے وہ جہانگیر و شاہجہاں میں محض اِس لیئے کہ یہ دونو ہندو رانیوں کے بطن سے پیدا ہوئے کسی قدر مدّھم پڑ گیا تھا۔ لیکن اورنگ زیب نے جس کی رگوں میں باپ اور ماں دونو طرف سے ترکی خوٗن موجود تھا۔ اس جوہر کو ذاتی کوشش سے از سرِ نو تازہ کیا۔ چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ شاہجہان جھروکے میں بیٹھا جنگی ہاتھیوں کی

لڑائی دیکھ رہا تھا - اور تینوں بڑے شہزادے
میدان میں گھوڑوں پر سوار اپنے فوجی
دستوں کے سامنے کھڑے تماشا دیکھ رہے
تھے - ہاتھیوں کی ٹکروں اور ریل پیل سے
میدان گردوغبار سے اٹ گیا - اور ایک
ہاتھی مقابلے سے ہٹ گیا - دوسرے کو
مقابل نظر نہ آیا - تو وہ جھنجلا کر اُدھر جھپٹا
جدھر شہزادے کھڑے تھے - دونو بڑے
شہزادے اور دوسرے لوگ ڈر کر اِدھر
اُدھر بھاگ گئے - لیکن اورنگ زیب جس
کی عمر اس وقت چودہ پندرہ سال سے
زیادہ نہ تھی - اپنی جگہ پر ڈٹا رہا - ہاتھی اسی
کی طرف لپکا - تو اورنگ زیب نے نیزہ
اس زور سے مارا کہ سر میں غرق ہو
گیا - ہاتھی نے جھنجلا کر گھوڑے کو سونڈ
میں لپیٹنا چاہا تو اورنگ زیب زین سے
کود پڑا اور تلوار سونت کر ہاتھی پر حملہ آور
ہوا - اسی اثنا میں دوسرا ہاتھی آ پہنچا - اور
دونو ایک دوسرے سے گتھ گئے - شاہجہان
اس کی جرأت و شجاعت دیکھ کر بہت خوش
ہوا - شہزادے کو اشرفیوں سے تلوایا - پانچ
ہزار اشرفی وزن ہوا - جو صدقے میں دیں -
اور بہادری کا خطاب دے کر کہا وہ خدا کا

شکر ہے کہ خبر گشدہ ہی ورنہ بہت رسوائی ہوتی۔ بیٹا ایسے موقع پر ہٹ جانا چاہیے" اورنگ زیب نے عرض کی غلام ہٹنے کے لیئے پیدا نہیں ہُوا۔ اور اگر نتیجہ اور ہوتا تو رُسوائی نہ ہوتی رُسوائی تو یہ ہے جو بھائیوں نے دکھلائی"

تخت نشینی کی جنگوں میں جس بہادری، استقلال اور جوانمردی کا ثبوت اُس نے دیا۔ اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس کے جسم میں رگ پٹھوں کی جگہ فولاد کے تار تھے۔ چنانچہ ساموگڑھ کے میدان میں جب اس کے چیدہ سے چیدہ رسالے پسپا ہو گئے۔ تو اس کے ایک امیر نے مشورہ دیا کہ لڑائی کا ڈھنگ بگڑتا نظر آتا ہے۔ گھوڑے پر آ جایئے کہ ہلاکت سے محفوظ رہیں۔ لیکن اس نے جواب دیا کہ میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ شام سے پہلے معاملہ ایک طرف ہو جائے یا تخت یا تختہ!" اور حکم دیا کہ ہاتھی کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دو تاکہ بھاگ نہ سکے۔

اِسی طرح شجاع کے خلاف کھجوہ کے میدان میں لڑائی ہوئی تو اُس نے اپنے فیلبان کو حکم دیا کہ جیسے بھی ممکن ہے میرے ہاتھی کو شجاع کے ہاتھی کے پاس پہنچا دو۔ تاکہ ہم دو تو دست بدست لڑ کر فیصلہ کرلیں۔

مرشد قلی ایک امیر نے عرض کی کہ ایسی شجاعت
بادشاہوں کے لیئے مناسب نہیں - اورنگ زیب
نے جواب دیا۔ وہ ہم میں سے کوئی ابھی تک
بادشاہ نہیں - آدمی اِسی قسم کی جرأت سے
بادشاہ بنتے ہیں اور بادشاہ بننے کے بعد اگر
کسی میں جرأت کم ہو جائے تو اُس کی
سلطنت قائم نہیں رہ سکتی"۔

ہمت و استقلال کا یہ پُتلا اور اِسلامی تدبّر
کا یہ مجسمہ بادشاہ ہوا - تو اُس نے سلطنت
کو خدا کی مقدس امانت اور اپنی حکومت کے
پچاس سال اِسی امانت کی حفاظت کا حق ادا
کرنے میں صرف کر دیئے - انتہا ہے کہ اُس
نے صرف اسی ایک مقصد کے لیئے اپنی زندگی
کے سب رشتوں اور تمام تعلقات کو نظر انداز
کر دیا اور خلقِ خدا کے امن و راحت کے
لیئے نہایت بے نفسی سے اپنے ذاتی آرام و
آسائش کو قربان کر دیا۔

مذہبی پابندی اور خوفِ خدا کا یہ عالم تھا۔
کہ اس نے کبھی نماز ترک نہیں کی - مشہور
واقعہ ہے کہ شہزادگی کے زمانے میں جب وہ
بلخ میں ازبکوں جیسی خونخوار قوم سے لڑ رہا تھا۔
تو عین اس وقت جب کہ ہر طرف سے
تیروں کی بارش ہو رہی تھی - وہ اطمینان

کے ساتھ ایک دستہ فوج کو الگ کر کے نماز ادا کرنے لگا۔ اُزبک سردار نے پہاڑی پر سے یہ حالت دیکھی تو یہ کہتے ہوئے جنگ بند کر دی۔

وہ ایسے خدا پرست جواں مرد سے لڑنا اپنی قسمت سے جنگ کرنا ہے، بادشاہ ہو کر ایک سال کے عرصے میں قرآن شریف حفظ کر لیا۔ اور فرض نمازوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ تہجّد کی نماز بھی کبھی ترک نہیں کی۔ ہفتے میں تین دن نفلی روزے رکھتا تھا۔ سفر ہو یا حضر ہمیشہ جمعہ اور عید کی نمازیں بھی عام مسلمانوں کے ساتھ پڑھتا تھا۔ اپنی روزی قرآن شریف کی کِتابت اور ٹوپیاں بنا کر کماتا اور سرکاری خزانے سے ایک پیسہ اپنی ذات پر خرچ کرنا حرام سمجھتا تھا۔

اُس نے اکبری عہد کے تمام غیر شرعی محصول یہ کہہ کر معاف کر دئیے کہ میں بُت پرستوں کی بُت پرستی سے بیت المال کو آلودہ کرنا نہیں چاہتا۔ اور اسلامی قانون کو رواج دیا۔ تمام عدالتوں میں شرعی وکیل مقرّر کر دئیے۔ جو حکومت کی طرف سے کی گئی زیادتیوں کی تلافی کرانے اور غریب لوگوں کے مقدمے

دائر کرتے تھے۔ اُس نے حکم دیا تھا۔ کہ رعایا کو بادشاہ پر بھی نالش کرنے کا حق حاصل ہے۔ روزانہ نہایت پابندی سے خود عدالتِ دیوانی میں بیٹھتا۔ غریبوں کی فریادیں سنتا اور خود اپنے ہاتھ سے ان پر حکم لکھتا تھا۔ غرض وہ اپنے باپ دادا اور بھائیوں کے خلاف آرام طلبی تن آسانی اور عیش و عشرت سے کوسوں دُور بھاگتا تھا۔ نواسی برس کی عمر میں بھی وہ میدانِ جنگ میں معمولی سپاہیوں کی طرح محنت کرتا اور تکلیف اُٹھاتا نظر آتا تھا۔ خلقِ خدا کے آرام و آسائش کے لیئے اپنی روزی کمانے اور خدا کی یاد و عبادت سے اتنی فرصت نہ ملتی تھی۔ کہ کبھی ایک پہر سے زیادہ اُس نے آنکھ لگائی ہو اور غفلت کی نیند سویا ہو۔

ایک مرتبہ کسی امیر نے عرض کی کہ "غیر معمولی محنت و جفاکشی سے اندیشہ ہے کہ کہیں حضور کی صحتِ جسمانی اور قوائے دماغی کو نقصان نہ پہنچے"

اورنگ زیب نے یہ بات سنتے ہی مُنہ پھیر لیا اور کسی دوسرے امیر سے مخاطب ہو کر کہا:۔

سب عالموں کا اِس بات پر اتفاق ہے

کہ رعایا کی بہتری اور بہبودی کے لیئے بادشاہ کا تلوار پکڑ کر میدان میں نکلنا اور شہادت حاصل کرنا فرض ہے۔ لیکن اس کے خلاف یہ شریف اور نرم دل خوشامدی چاہتا ہے کہ رعایا کے آرام و آسائش کے لیئے مجھے ذرہ برابر بھی تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ اس کا مشورہ یہ ہے کہ میں اپنی تندرستی کے لیئے لاکھوں غریب و کمزور انسانوں کی آسائش کا خیال نہ کروں۔ اور اس وسیع سلطنت کا کام کسی وزیر کے بھروسے چھوڑ دوں۔ حالانکہ قیامت کے روز جواب دہی کا بوجھ مجھ پر ہوگا۔ وزیر پر نہیں۔ خدا نے مجھے بادشاہ اپنے ذاتی فائدے۔ اور ذاتی آرام و آسائش کے لیئے نہیں بنایا۔ بلکہ دوسروں کے آرام و راحت کے لیئے محنت و مشقت اُٹھانا میرے لیے واجب قرار دیا ہے۔ مجھے تو صرف اسی قدر آرام کرنا چاہیے کہ عوام کی راحت کی خاطر زیادہ مستعدی سے کام کرنے کے لائق ہو جاؤں۔ اس نیک آدمی سے کہہ دیجئے کہ اپنا فرضِ منصبی دیانتداری سے سرانجام دیتا رہے اور ہمیں کبھی ایسا مشورہ دینے کی تکلیف نہ کرے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا وہ آخری

دیندار بادشاہ ہے۔ جس کی قلمرو میں کابل و غزنی سے راس کماری تک پورا ملک شامل تھا۔ اتنی وسیع سلطنت کا فرمانروا اپنی ذاتی ضرورتوں کے لیئے مزدوری کرے۔ اور خزانہ شاہی سے ایک پیسہ بھی اپنے لیئے صرف کرنا چوری اور خیانت سمجھے۔ دین داری اور زہد و تقویٰ کی انتہائی مثال ہے۔ جو اُس کے بعد رُوئے زمین کے کسی بادشاہ یا حاکم میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی

نواسی برس کی عمر میں آخر وقت آیا۔ تو وہ دکن میں ایک مجاہد کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کی اسلامیّت و دین داری کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ مخلوقِ خدا کے اِس لیے دام خادم نے اپنی تجہیز و تکفین بھی سرکاری روپے سے گوارا نہ کی اور ہدایت کی کہ میرے کفن کے لیے کھدّر کا معمولی کپڑا اس روپے سے خریدا جائے جو میں نے ٹوپیاں سی کر جمع کئے ہیں۔ اور تین سو پانچ روپے جو میں نے قرآن مجید کی کتابت سے پیدا کیے تھے۔ وہ خیرات کر دیئے جائیں۔ آخیر ۱۷۰۷ء میں دنیا کا یہ آخری دیندار بادشاہ فوت ہوا۔ اور حیدر آباد دکن کے شہر اورنگ آباد میں

دفن کیا گیا۔ قبر اس کی وصیت کے مطابق بہت سادہ اور اندر مٹی سے بھری ہوئی ہے۔

شجاعت کی وجہ سے اس جنگ میں پانڈو کو فتح ہوئی۔ ورنہ کثرت فوج اور ظاہری ساز و سامان کے لحاظ سے کورو بہت زیادہ طاقت ور اور مضبوط تھے۔ ایک بڑا غضب یہ ہوا کہ جب بڑے گھمسان کا رن پڑ رہا تھا خون کی ندیاں بہ رہی تھیں اور دھڑا دھڑ آدمیوں کے سر کٹ کر زمین پر گر رہے تھے تو اتنے زبردست کشت و خون کو دیکھ کر پانڈو کے سپہ سالار ارجن کو بڑا رنج ہوا اور اس نے عین لڑائی کے دوران میں لڑنے سے انکار کر دیا۔ اس نازک موقع پر سری کرشن جی کی عقلمندی کام آئی۔ اُنھوں نے ایک بڑا زبردست لکچر ارجن کو دیا جس میں اس بات کو ثابت کیا کہ اپنا حق حاصل کرنے کے لئے تلوار چلانا عین ثواب کا کام ہے۔ لکچر بڑا پر زور اور مدلل تھا۔ جس کا ارجن کے دل پر بڑا اثر ہوا اور وہ دوبارہ لڑنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اور ایسی بے جگری سے لڑا کہ آخر کار فتح پائی۔

جس کتاب میں اس لڑائی کا مفصل حال لکھا ہوا ہے۔ وہ مہابھارت کہلاتی ہے۔ اور وہ لکچر جو عین میدان جنگ میں سری کرشن جی نے دیا تھا۔ بھگوت گیتا کے نام سے مشہور ہے۔ ان دونوں کتابوں کو ہندو بہت مقدس سمجھتے اور انہیں پڑھنا بڑے ثواب کا کام جانتے ہیں۔

مہابھارت کے بعد سری کرشن جی کو اور بھی کئی لڑائیاں ہندوستان کے مختلف راجاؤں سے لڑنی پڑیں یہ راجہ بہت ظالم تھے اور اپنی رعایا کو سخت تکلیفیں دیا کرتے تھے۔ کرشن جی نے سب کو شکستیں دیں اور خلقت کو اُن کے ظلم سے نجات دلائی۔

کرشن جی ایک دن جنگل میں ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ کسی شکاری نے ہرن کے تیر مارا ہرن تو بچ کر نکل گیا۔ مگر وہ تیر سیدھا کرشن جی کے آ کر لگا۔ جس سے آپ کا کام تمام ہو گیا اور ہندوستان اُس وقت کے سب سے زیادہ بہادر اور سب سے زیادہ نیک انسان سے خالی ہو گیا۔

طارق اعظم

زمانۂ حال کے جغرافیئے میں ایک لفظ جبرالٹر بھی آتا ہے۔ یہ لفظ بظاہر انگریزی زبان کا معلوم ہوتا ہے۔ مگر در اصل یہ لفظ جبل طارق کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اور ایک پہاڑ کا نام ہے۔ جو اندلس کے کنارے مثلث شکل کا سمندر کے اندر واقع ہے جس کے اوپر طارق اعظم نے اپنی فتح کی یادگار میں ایک قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ پہاڑ اور قلعہ جبل طارق (طارق کا پہاڑ) کے نام سے مشہور ہوا۔ مگر پھر بگڑ کر جبرالٹر بن گیا۔ چنانچہ جغرافیہ اور تاریخ کی کتابوں میں یہی لکھا ہوا پایا جاتا ہے۔ اور لوگ اصل واقعہ بھول گئے ہیں پس یاد رہے کہ اصل الفاظ عربی زبان کے جبل الطارق ہیں۔

طارق ابن زیاد جو اپنی شجاعت اور

کارناموں سے اعظم کہلایا۔ موسٰی بن نصیر کا غلام تھا۔ مگر اپنے آقا کی تربیت اور اسلامی تعلیم مساوات کی بدولت بہت بڑا آدمی بن گیا۔ یعنی سپہ سالارِ اعظم اور فاتح۔

موسٰی بن نصیر ۹۰ھ میں بحیرہ روم کے جنوبی ساحل اور افریقہ کے شمالی ساحل پر حکمران تھا۔ اور بنو امیّہ کے عہدِ حکومت کا مشہور سپہ سالار تھا اور اُس کے دارالحکومت کا نام تھا۔ قیروان جو مغرب اقصٰی کا شاندار شہر ہے۔ موسٰی نے ۷۱۰ء میں شمالی افریقہ کے گورنر کی حیثیت سے حکمران وقت ولید بن عبدالملک کی اجازت سے اُندلس کا رُخ کیا تھا۔ اور آخر کار مجاہدین اسلام اُس کی قیادت میں یورپ پر پرچم اسلام لہرانے میں کامیاب ہوتے تھے۔

موسٰی نے ۹۲ھ میں فتح اندلس کی غرض سے ایک ایسے کماندار کی ضرورت محسوس کی جو کم فوجی جمیعت سے ایسا کارنامہ کر دکھائے جو تاریخ میں زندگی جاوید حاصل کرے چنانچہ اس کی نظر انتخاب طارق بن زیاد پر پڑی۔ اور اس کا انتخاب کامیاب اور مبارک ثابت ہوا۔ ہم یہ

لکھ چکے ہیں کہ طارق موسیٰ کا غلام تھا۔ لیکن قابل تھا۔ بہادر تھا۔ پھر مسلمان تھا یعنی اسلامی مساوات اور برادری کے لحاظ سے موسیٰ یا کسی اور مسلمان سے درجے میں کم نہیں تھا۔

سپہ سالار طارق کو سات ہزار سپاہ ملی مگر اس کے علاوہ مختصر سا فوجی بیڑا بھی ملا۔ مسلمانوں کا یہ لشکر اللہ اکبر کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور پھر چل دیا اور تکبیر کے نعرے لگاتا ہوا اور بحر و بر کو گونجاتا ہوا مغرب کی طرف جادہ پہنچ گیا۔

اول مجاہدین اور سپہ سالار طارق نے بحر ازرق عبور کیا۔ اور پھر وہ یورپ کے ساحل پر لنگر انداز ہو گئے۔

اس وقت یورپ کے تمام ملکوں میں عیسائیت پھیلی ہوئی تھی۔ اور قدیم مذہب قریب تباہ ہو چکا تھا۔ اور اب اسلام کا مبارک قدم یہاں پہنچا۔

طارق نے اس سرزمین پر قدم رکھتے ہی سب سے پہلے خانۂ خدا تعمیر کر کے گویا سب سے پہلے یہ اعلان کیا۔ کہ مجاہدین اسلام حکومت و شوکت اور دولت کے بھوکے نہیں بلکہ دنیا کو تحفۂ توحید

عطا کرنا اپنا فرض اور اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔

اُس وقت ہسپانیہ میں قدیم فرانسیسی قوم آباد تھی۔ جسے گاتھ نام دیا گیا تھا۔ اُس قوم کے افراد کروڑوں کی تعداد میں تھے۔ مگر عام طور پر یہ شہری تھے۔ یعنی لاکھوں فوج ان کے علاوہ تھی۔

مجاہدین کی تعداد بتائی جا چکی ہے۔ یعنی کُل سات ہزار کے قریب مگر مجاہدینِ اسلام اپنی فتح کا یقین رکھتے تھے۔ کیونکہ اُن کو خدا تعالیٰ پر کامل بھروسہ تھا۔ اور اُن کو اپنی قوت ایمانی پر بھی اعتماد تھا۔ اُن کے نزدیک اکثریت اور کثرتِ تعداد زیادہ قابلِ توجہ نہ تھی۔

کیونکہ اُن کو دین اسلام نے تعلیم دی ہے۔ کہ اگر خدا تعالیٰ چاہے تو وہ اقلیّت کو اکثریت پہ غالب کر سکتا ہے اور اس کی تصدیق تاریخ نے بار بار کی ہے۔ خصوصاً تاریخ اسلام نے آغاز ہی میں ایسے نظارے پیش کیے ہیں۔ طارق نے دوسرا کام یہ کیا کہ اپنا بحری بیڑا نذر آتش کر دیا۔ یعنی اگر خدا نخواستہ ناکامی ہو تو آخری راہِ فرار بھی مسدود ہو اور یہ حرکت خود سپہ سالار

یعنی اس بیڑے کے ناخدا نے کی۔
بعض مجاہدین نے دل میں کہا۔ کہ اگر خدا نخواستہ ہم کامیاب نہ ہوئے یعنی یہ ملک فتح نہ کر سکے تو ہمارا انجام کیا ہوگا اکثر سپاہی اور افسر خاموش رہے۔ مگر ایک افسر سے ضبط نہ ہو سکا چنانچہ وہ بول اُٹھا۔
جناب آپ نے یہ کیا کہا؟ کیا یہ اقدام دور اندیشی اور تدبیر سے بعید نہیں ہے۔؟ وطن دور دراز فاصلے پر ہے۔ اور پھر کیا وسائل حفاظت نظر انداز کر دینا دانش مندانہ فعل ہے؟ نہیں شاید یہ تو قانون شریعت میں بھی جائز نہیں!
مگر طارق نے مجاہد کے الفاظ سُنے تو ہنسا۔ اور پھر تلوار کے قبضے پر ہاتھ لے جا کر بولا کہ
(ع) ہر مُلک ملک ما است کہ مُلک خدائے ما است
ہر مُلک ہمارا ہے اس لئے کہ ہمارے خدا کا ملک ہے۔
اس کے بعد طارق نے تمام مجاہدین کو صفوں میں کھڑا کیا۔ اور اُن کے سامنے نہایت پُرجوش تقریر کی۔ چنانچہ کہا۔

اے مجاہدینِ اسلام بھائیو! ایک دشمن قوم تمہارے سامنے ہے۔ اور دوسرا دشمن یعنی سمندر بس پشت ہے۔ لہٰذا تاخیر و تامل کا کیا موقع ہے؟ بڑھو اور تلواریں سنبھال کر مصروف جہاد ہو جاؤ۔ اپنی مدد کرو خدائے تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا۔ ہمتِ مرداں مددِ خدا مشہور ہے۔ خدا تعالیٰ نے بار بار ہم مسلمانوں کی امداد کی ہے کیونکہ ہم اس کے سپاہی ہیں اور اس کی خدمت اور اس کے دین حق کے واسطے وطن سے نکلے ہیں۔ طارق نے ایک ایک مجاہد کے دل میں گویا بجلیاں بھر دیں۔ اور وہ کچھ سے کچھ ہو گئے۔ جس کا نتیجہ کامیابی کے سوا اور ہو ہی نہیں سکتا! کیونکہ قدرت کا قانون یہی ہے۔

قوم گانھ کا سردار اور حکمران کونٹ جولین تھا۔ جس کا مذہب عیسائی تھا۔ اس کی فوجوں نے مجاہدینِ اسلام کا مقابلہ کیا۔ مگر چند ہی روز کے بعد مجاہدین کی چابک دستی نے عیسائیوں کو ان کی کامیابی سے مایوس کر دیا۔ لہٰذا میدان چھوڑ کر شہر قیوطہ کے متصلہ قلعے میں محصور ہو گئے۔ اور فوج بھی میدان چھوڑ

کر قلعے میں جا چھپی۔

مجاہدین کے حق میں یہ مبارک فال تھی کہ پہلا ہی حملہ کامیاب ہُوا تھا۔ اور دشمن خائف ہو کر میدان سے بھاگ گیا تھا۔ یعنی خود ہی گویا قلعے میں اسیر ہو گیا تھا۔ طارق کا دل بھی بڑھ گیا۔ اور اُس نے اور تمام مجاہدین نے شکرانے کے نفل پڑھے۔

اب لشکرِ مجاہدین للکارتا ہُوا قلعہ قیوطہ کے قریب جا پہنچا اور ہر طرف سے اس کا محاصرہ کر لیا۔ کونٹ جولین اور اُس کے رفیق محاصرے سے جلد ہی تنگ آ گئے کیونکہ باہر سے آنے جانے کا راستہ مسدود ہو گیا تھا۔ اور قلعے کے اندر کی غذا قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔

کونٹ جولین نے سپہ سالارِ اسلام طارق کی خدمت میں پیغام امان بھیجا۔ اور شرائط جو لکھیں وہ مجاہدین کے موافق تھیں۔ چنانچہ کونٹ نے لکھا کہ قسمت نے ہماری رفاقت نہیں کی۔ بلکہ مشیّت نے آپ کی تائید کی ہے۔ بس ہم آپ سے امان چاہتے ہیں؟ اور قلعہ قیوطہ آپ کی نذر ہے۔ ایک قلعہ کیا

تمام ملک اُندلس ہی آپ کے مجاہدین کا حق ہے۔ آپ براہِ مہربانی جزیرہ الخضرہ میں تشریف لائیے۔ ہم آپ کا استقبال کریں گے۔

طارق اور بکتی سو مجاہدین جہاز پر سوار ہو کر جزیرہ خضرا پہنچے تو عیسائیوں نے ان کا استقبال نہایت احترام کے ساتھ کیا طارق نے جولین اور اس کے تمام رفیقوں کو امان دی۔ اور اُن کی جان بخشی کی۔ بہر حال اب تمام اُندلس زیر لوائے اسلام تھا۔ اور کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس فتح نے طارق اور مجاہدین کے دل جوش مسرت سے بھر دیئے۔ اب اس فتح کی یادگار میں مثلث پہاڑ کے اوپر قلعۂ جبل طارق تعمیر کیا گیا۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے۔

اس کے بعد مجاہدین اسلام نے اُندلس کے علاوہ شہر قسطان (کیسٹل) سے لے کر پرتگال تک کے علاقے پر بھی پرچم اسلام لہرایا۔

اس جنگ کا فیصلہ نو دس دن کے اندر ہی ہو گیا۔ یعنی صرف سات ہزار مجاہدین اسلام نے ایک لاکھ فوج کو

مغلوب کر لیا۔ اور اس فوج کو نیچا دکھایا
جس کے تمدن کی عمر آٹھ سو سال سے
کم نہیں تھی۔

اس فتح نے تاریخ میں ایک جدید کماندار
کا اضافہ کیا۔ اور جغرافیے میں بھی نئے پہاڑ
جبل الطارق کا۔

اور یہ فتح ۵ شوال سنہ ۹۲ھ کو یوم عید
سے پانچ دن بعد رونما ہوئی۔ طارق اور
اس کے رفیق مجاہدین کے سینے قوتِ ایمان
سے پر تھے۔ اور اُنہیں تائید ایزدی کا
کامل یقین تھا۔ اس لئے کامیابی ہر جگہ
اُن کا استقبال کرتی اور ان کے قدم
چومتی تھی۔ اور خدائے تعالیٰ بھی ان کی
امداد کرتا تھا اس زمانے کے مسلمانوں کے مقابلے میں
مسلمانوں کی حالت ظاہر ہے۔ یعنی مسلمین
سابقین کے مقابلے میں ہم مسلمان نہایت
پست ہیں غیر مسلموں سے بھی کم! اور
اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ ہمیں خود
اعتمادی نصیب نہیں ہے۔ اور ہمیں
تائید ایزدی کا کامل یقین نہیں۔ لیکن اگر
پاکستانی مسلمان حقیقی معنوں میں مسلمان
بن جائیں۔ اور عمل صالح اختیار کر لیں
تو وہ بھی سابقین مسلمین کی مانند۔ طاقت

دولت اور مستحکم سلطنت کے مالک بن سکتے ہیں۔ خدا تعالیٰ ہمیں نیک توفیق عطا کرے۔ آمین

سعدی شیرازیؒ

حضرت سعدی شیرازی ایران کے بہت بڑے شاعر تھے۔ گلستان۔ بوستان اُن کی بہت مشہور کتابیں ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں بڑی عمدہ عمدہ اخلاقی کہانیاں سعدی نے لکھی ہیں۔ دونوں کتابیں بہت ہی آسان۔ دلچسپ اور مفید ہیں۔ دنیا کی بہت سی زبانوں میں ان کتابوں کے ترجمے ہو چکے ہیں بعض حکایتیں تو بہت ہی مزے کی ہیں۔

سعدی کا اصلی نام مصلح الدین تھا۔ اور وہ ملک ایران کے شہر شیراز میں ۱۱۸۴ئہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے باپ نے ان کی نہایت عمدہ تربیت کی اور اُنہیں اچھی تعلیم دلائی۔ سعدی بچپن ہی سے نہایت نیک۔ مؤدّب۔ فرمانبردار اور نماز روزے کے بہت پابند تھے اور ان کو بات بات پر ٹوکتا رہتا تھا۔ سعدی خود لکھتے ہیں کہ بچپن میں ایک دفعہ باپ نے مجھے تہجّد کی نماز کے لئے جگایا۔ میں اُٹھا تو دیکھا کہ گھر کے سارے آدمی بے خبر پڑے سو رہے ہیں۔ میں کہنے لگا کہ یہ لوگ تو اس طرح سو رہے ہیں جیسے مردہ ہوں۔ یہ سن کر میرے باپ نے کہا کہ میاں

اگر تم بھی سوتے رہتے تو یہ بات اس سے بہتر تھی کہ تم لوگوں کی غیبت کرو۔

جب سعدی بڑے ہوئے تو باپ نے اُنہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے مدرسہ نظامیہ میں بھیج دیا۔ جو بغداد میں علومِ اسلامیہ کا سب سے بڑا کالج تھا اور جہاں طلبار دور دور سے پڑھنے آتے تھے۔ مدرسہ نظامیہ میں سعدی نے حضرت علامہ ابنِ جوزیؒ سے تعلیم پائی جو دنیائے اسلام کے بہت بڑے فاضل انسان تھے اور آج تک عالم لوگ اُن کا نام بڑی عزّت سے لیتے ہیں۔

جب سعدیؒ پڑھائی سے فارغ ہوئے تو اُنھوں نے ارادہ کیا کہ تمام اسلامی ممالک کی سیر کروں۔ آدمی غریب تھے۔ اس لئے پیدل چلے کہیں سواری پر۔ کہیں قافلے کے ساتھ۔ غرض مختلف طریقوں سے اُنھوں نے دُنیا کی سیاحت کی جن جن ملکوں کی سیر سعدی نے کی ہے۔ اُن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں۔ ایشیائے کوچک۔ بربر۔ حبش۔ شام۔ فلسطین۔ آرمینیا۔ عرب۔ ایران۔ توران۔ ہندوستان۔ ویلم۔ کاشغر بصرہ۔ بغداد۔ بلخ۔ خراسان۔ طرابلس۔ دمشق۔ دیار بکر۔ اقصائے روم۔ سکندریہ اور مصر وغیرہ ان سب کی سیاحت کا اندازہ اس سے لگاؤ۔ کہ اُنھوں نے مکّہ معظمہ کے چودہ حج پیدل چل کر ادا کئے۔ ساری عمر درویشی کی حالت

میں گزار دی - نہ روپیہ کمایا نہ پیسہ جمع کیا - آخر سنہ ۱۲۹۲ء میں بعمر ۱۰۸ سال وفات پائی - اُن کا مزار شیراز سے تین میل دُور اب تک موجود ہے۔ اُسی کے قریب ایک گاؤں بھی آباد ہو گیا ہے جسے سعدیہ کہتے ہیں -

علامہ جمال الدین افغانی

علامہ جمال الدین افغانی ۱۲۵۴ھ میں افغانستان کی سرزمین میں پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش کے وقت اردگرد کے ممالک عجیب سیاسی کشمکش میں مبتلا تھے۔ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت حکومت کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ وسط ایشیا میں روسی شہنشاہیت خیوا اور بخارا کی آزادی کو ختم کر رہی تھی۔ مصر میں سلطان ترکی کے اقتدار کا خاتمہ ہو چلا تھا۔ ایران میں یورپین طاقتیں اپنا اپنا حصہ بانٹ رہی تھیں۔ ترکی کی حالت سب سے ابتر تھی۔

آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت زیادہ تر کابل ہی میں ہوئی۔ آپ نے بچپن ہی میں اپنے ملک کے اہلِ حکومت کی کارگزاریوں کا جائزہ لے لیا تھا۔ انہی ایام میں آپ نے ہندوستان میں چند روز قیام کے بعد حج کی غرض سے مکہ کا رُخ کیا۔ اور ۱۸۶۱ء کے قریب واپس آئے۔

واپسی پر آپ نے اپنے ملک کی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ دوسرے رہنماؤں کے مقابلے میں آپ کو اس لئے ایک ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ کہ باقی رہنما کسی ایک ملک یا کسی ایک ہی جغرافیائی حد کے اندر اپنا کام کر رہے تھے۔ لیکن آپ کا دائرۂ عمل ان تمام

حدود سے آزاد تھا۔ چنانچہ آپ نے نہ صرف افغانستان بلکہ مصر ایران ہندوستان۔ عراق۔ مراکش۔ بخارا اور ترکستان کو اپنی جد و جہد کا میدان قرار دیا۔

چونکہ آپ عوام کی تنظیم اور رائے عامہ کو بیدار کرنے کے لئے قومی اخبارات کا وجود بہت ضروری سمجھتے تھے۔ اس لئے افغانستان میں آپ نے پہلا اخبار شمس النہار کے نام سے جاری کر دیا۔ تھوڑے عرصہ بعد آپ ہندوستان آئے۔ اور محض ایک ماہ قیام کے بعد مصر پہنچے مگر ادھر بھی آپ کی تقریریں برطانوی سیاست کے لئے خوشگوار ثابت نہ ہوئیں۔ اس لئے انگریزوں نے ان کے نکالنے کی کوشش کی۔ چنانچہ آپ صرف ۴۰ دن مصر میں ٹھہرنے پائے۔ ان ایام میں قسطنطنیہ میں قوم پرستوں کی ایک چھوٹی سی جماعت پیدا ہو چکی تھی۔ چنانچہ آپ مصر سے رخصت ہو کر قسطنطنیہ پہنچے۔ چند ہی روز بعد آپ کی ملاقات عالی پاشا وزیر اعظم سے ہوئی۔ جو آپ کے علم و فضل سے بہت متاثر ہوا۔ اور آپ کو انجمن معارف میں شریک کر لیا۔ مگر آپ کی ہر دلعزیزی اور شہرت کی وجہ سے بہت سے حاسد پیدا ہو گئے۔ چونکہ آپ ایک بیباک اور حق گو انسان تھے۔ اور اکثر اپنے لیکچروں میں شہنشائیت پر بھی اعتراض کیا کرتے تھے۔ اس لئے حکومت پرست لوگ اور وزرا بھی آپ سے ناراض رہنے لگے۔ ۱۲۸۷ھ میں آپ نے مسجد فاتح سلطان محمدؒ میں ایک ایسی تقریر کی۔ جس سے ایک طوفان اٹھا اس طوفان نے قسطنطنیہ میں آپ کا قیام ناممکن کر دیا۔ اور آپ کے خلاف کفر کا فتوے تیار ہو گیا۔ قسطنطنیہ کے قیام کے دوران میں آپ کی طبیعت کی تمام خصوصیات اچھی طرح ظاہر ہو گئیں۔ دوستوں نے سمجھ لیا۔ کہ آپ کسی حالت میں بھی باطل سے نہیں دبتے۔ اور اپنی جرأت، بے باکی، قابلیت اور قوت ایمان کی بدولت کسی طاقت سے مرعوب نہیں ہوتے۔ آپ نے بھی اس زمانہ میں صحیح

طور پر مخالفین کی قوت کا جائزہ لیا۔ اور اس نتیجہ پر پہنچے۔ کہ مسلمانوں کی اصلاح کا کام قدیم علما کی اصلاح سے شروع ہونا چاہیئے۔ آپ کا یہ تجربہ ایران میں بھی کام آیا۔ قسطنطنیہ ہی میں پہلی دفعہ آپ کو حکومت کی قوت سے واسطہ پڑا۔ جو کچھ وہاں آپ نے دیکھا۔ وہ آپ کی سیاسی زندگی کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ چونکہ یہاں سلطان اور دیگر ارکان سلطنت آپ کی سیاسی دلچسپیوں سے خوفزدہ ہو گئے تھے۔ اس لئے آپ نے دوبارہ پھر مصر کا رُخ کیا۔

آپ جب دوبارہ مصر میں داخل ہوئے۔ تو خدیو اسمٰعیل برسرِ حکومت تھا۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کے قدم آگے بڑھتے آتے تھے۔ نہر سویز جاری ہو چکی تھی۔ اور اسماعیل کی بداعمالیوں نے ملک اور رعایا کو تباہ حال کر دیا تھا۔ اس وقت مصر کا قرضہ ساڑھے نو کروڑ پونڈ تھا۔ ۱۸۷۵ء اور ۱۸۸۰ء کا درمیانی زمانہ مصر کے مصائب کا بدترین زمانہ تھا۔ اور یہی وقت آپ کی جدوجہد کا تھا۔ مصر میں داخل ہونے کے چند ہی روز بعد آپ کے فضل و کمال کا شہرہ ریاض پاشا وزیر اعظم کے کانوں تک پہنچا۔ پہلی ہی ملاقات میں آپ کی شخصیت نے ان پر اتنا اثر جما دیا۔ کہ خود وزیر اعظم کی طرف سے اصرار کیا گیا۔ کہ آپ زیادہ عرصہ تک مصر میں قیام فرمائیں۔ چنانچہ خدیو نے ریاض پاشا کے کہنے پر آپ کے لئے ایک ہزار قرش مصری (تقریباً ۱۴۰ روپے) ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس دفعہ مصر میں آپ نے پوری طاقت سے اصلاح کا کام شروع کیا۔ آپ کی ذہانت و جدت یہ تھی۔ کہ آپ نے اسلامی ممالک میں مغربی خیالات رکھنے والوں کی ذہنیت کی اصلاح کرنے کی کوشش کی اور یہ بات واضح کی۔ کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے۔ جو ہر زمانے میں انسانوں کی تمام ضروریات کا کفیل

ہو سکتا ہے۔

آپ ان لوگوں میں سے نہ تھے۔ جو صرف علمی صحبتوں میں خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ آپ کی فطرت پارہ کی طرح بے چین تھی۔ اور آپ کی نظر بہت دور تک جاتی تھی۔ اس لئے محض ازہر کے مصلّے پر بیٹھے رہنا اور سبق پڑھانا کوئی دلچسپ کام نہ تھا۔ آپ اس مصلّے سے چند روز بعد ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور ملک میں ہر قسم کی انجمنیں اور جماعتیں قائم کرنی شروع کیں۔ آپ کی قائم کی ہوئی سب سے بڑی انجمن وہ تھی۔ جو انجمن حیات الوطنی کے نام سے مشہور ہے اس انجمن کی کامیابی نے جلد ہی انگریزوں کو بہت خوف زدہ کر دیا۔ چنانچہ لارڈ کرومر نے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا۔ کہ "اگر یہ انجمن مصر میں ایک سال اور قائم رہی۔ اور جمال الدین مصر میں مقیم رہے۔ تو برطانوی اثرات تباہ ہو جائیں گے"۔

مختلف قسم کی انجمنیں بنانے کے علاوہ مصر میں آپ نے سب سے بڑا کام جو کیا۔ وہ یہ تھا۔ کہ آپ نے ملک کے تمام طبقوں میں خصوصاً عوام کے اندر اخبار نویسی اور اخبار بینی کا ذوق پیدا کر دیا۔ آپ نے نہ صرف مصر کا مشہور اخبار مصر جاری کر دیا۔ بلکہ دو پرچے اور بھی عربی زبان میں نکلوائے۔ ان میں ملک کے حالات پر بہت جرأت کے ساتھ تبصرہ کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ خدیو اور اس کے وزرا تک نکتہ چینی سے محفوظ نہ تھے۔ آپ کا عقیدہ تھا۔ کہ تنظیم ملّت کے لئے ہر ایک ملک میں اخبار نویسی کو آلۂ کار بنانا نہایت ضروری ہے۔ گو آپ کا وجود برطانوی مفاد کے لئے نقصان دہ تھا۔ مگر خدیو اسمٰعیل اپنے ذاتی اغراض کو مدِ نظر رکھ کر اور اپنے یورپین قرض خواہوں کو دھمکانے کے لئے قوم پرست جماعت کا قائم رکھنا ضروری سمجھتا تھا۔ اس لئے آپ کو مصر میں کافی عرصہ

قیام کرنے کا موقع مل گیا۔ اس زمانہ میں چونکہ توفیق بے عام طور پر قوم پرستوں کا ہمدرد اور معاون سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے آپ کی جماعت کی یہ قدرتی خواہش تھی۔ کہ اگر اسمٰعیل کسی طرح معزول ہو جائے۔ اور توفیق بے اس کا جانشین قرار پائے۔ تو قوم پرستوں کو من مانی مرادیں حاصل ہو سکتی ہیں مگر جب اسمٰعیل کی جگہ توفیق بے نے حکومت سنبھالی۔ تو تخت پر قدم رکھتے ہی اس کے تمام خیالات بدل گئے۔ اور ثابت ہو گیا۔ کہ وہ تخت حکومت حاصل کرنے کی امیدوں میں قوم پرستوں کو محض دھوکہ دے رہا تھا۔ توفیق بے کو مصر میں آپ کا قیام ایک نظر نہ بھاتا تھا۔ چنانچہ آپ کا اخراج اس طرح عمل میں آیا۔ کہ ایک روز رات کے دو بجے ایک دستہ فوج نے آپ کی قیام گاہ بمقام "خان خلیل" کا محاصرہ کر لیا۔ اور جس حالت میں آپ سو رہے تھے۔ اسی حالت میں جگا کر سپیشل ٹرین میں بٹھا کر سویز بھیج دیا گیا۔ ایرانی سفیر نے سویز جا کر آپ کی خدمت میں ذاتی خرچ کے لئے تین ہزار پونڈ پیش کئے۔ مگر آپ نے اس رقم کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اور فرمایا۔ شیر تو جہاں جاتا ہے۔ اپنے لئے خود غذا پیدا کر لیتا ہے۔ اس طرح بے سرو سامانی کی حالت میں ستمبر ۱۸۷۹ء کو آپ مصر سے رخصت ہوئے مگر اپنی تحریک کا جو بنیادی پتھر وہاں نصب کر گئے۔ آپ کے بعد اسی پر آپ کے جانشینوں نے ایک بہت بڑی عمارت بنا لی۔ ممالک اور اقوام کی تاریخوں میں ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ کہ ایک غیر ملک اور غیر نسل کا آدمی کسی اجنبی ملک کو اپنا ملک اور کسی اجنبی قوم کو اپنی قوم بنا کر اور اس طرح ہر قسم کی قربانیاں کر کے اس ملک کی خدمت کرے۔ اور اس کا اپنا بن جائے۔

۱۸۷۹ء میں آپ مصر سے رخصت ہو کر ہندوستان پہنچے۔ اور براہ راست حیدر آباد تشریف لے گئے۔ حیدر آباد میں آپ کے علم و فضل

کا اس قدر شہرہ ہوا۔ کہ سر سالار جنگ اول نے آپ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اور آپ کو ملازمت میں لینا چاہا۔ مگر آپ نے ایک دن نواب صاحب کو تنہائی میں سمجھایا۔ یہاں میری ترقی کو دیکھ کر بہت سے لوگ حاسد بن جائیں گے۔ اور پھر ذلت کے ساتھ یہاں سے نکلنا پڑے گا۔ نیز انگریزوں کو میرے خلاف بھڑکایا جائیگا۔ انہی خیالات کی بنا پر آپ نے ملازمت سے انکار کر دیا۔ حیدر آباد کے قیام کے زمانہ میں آپ کو یہ خیال پیدا ہوا تھا۔ کہ مسلمانوں کے لئے ایک یونیورسٹی ایسی بنائی جائے جس میں ہر قسم کی تعلیم مادری زبان میں دی جایا کرے۔ وہ مغربی علوم کی تعلیم کو مسلمانوں کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔

ہندوستان میں دو سال کے قریب قیام کر کے آپ اہلِ ہند کے حال سے بخوبی واقف ہو گئے تھے۔ آپ جانتے تھے۔ کہ ان کا قومی شیرازہ کیوں بکھرا ہوا ہے۔ کمزوریاں کیا کیا ہیں۔ اور ان کو کس طرح رفع کیا جا سکتا ہے۔ ذاتی طور پر آپ کا عقیدہ تھا۔ کہ کسی قوم کو بیدار کرنے اور اس کے اندر قومیّت کا احساس پیدا کرنے کیلئے اخبارات کا اجرا بہت ضروری ہے۔ مصر میں وہ اس تدبیر کے کامیاب نتائج دیکھ چکے تھے۔ اور ہندوستان کے موجودہ اخبارات کی زبوں حالی کو بھی اچھی طرح دیکھ رہے تھے۔ اس لئے وقتاً فوقتاً مضامین لکھ کر ہندیوں کی توجہ اس طرف دلاتے رہتے تھے۔

حالانکہ آپ کو مصر سے نکالا جا چکا تھا۔ مگر پھر بھی مصر کی سیاسیات سے آپ کے تعلقات خطرناک سمجھے جاتے تھے۔ جن دنوں آپ ہندوستان میں مقیم تھے۔ اس وقت مصر میں پھر شورش برپا ہو گئی۔ ان ایام میں آپکو دفعتاً انگریزی نگرانی میں حیدر آباد سے کلکتہ پہنچا دیا گیا۔ اور آپ وہاں نظربندی کی حالت میں رکھے گئے۔ مگر مصر میں شورش ختم ہونے پر آپ

کو کلکتہ سے روانگی کی اجازت مل گئی۔
۱۸۸۳ء کے موسم بہار میں آپ لندن پہنچے۔ لیکن چند ہی روز بعد پیرس تشریف لے گئے۔ کیونکہ آپ پیرس میں بیٹھ کر اسلامی ممالک کی آزادی کے لئے پروپیگنڈہ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ پیرس کے اخبارات اور رسالوں میں آپ کے مضامین چھپنے شروع ہو گئے۔ فرانس کے ایک مشہور فلاسفر کا دعوے تھا۔ کہ اسلام کی تعلیم جدید سائنس سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی۔ آپ نے اس نظریہ کی تردید کی۔ اور ثابت کر دیا۔ کہ اس کے متعلق اسلام سے زیادہ خود عیسائیت کا طرز عمل قابل اعتراض ہے آپ کے پیرس پہنچنے سے چند ہی روز بعد آپ کے رفیق اور شاگرد مفتی محمد عبدہ بھی وہاں پہنچ گئے۔ نیز نوجوان سعد زاغلول اور مرزا باقر ایرانی بھی آپ کے پاس پیرس آ گئے۔ اس طرح پیرس میں آپ کے پاس ایک معقول جماعت جمع ہو گئی۔ ان سب نے مل کر اصلاح و بہبودی کا کام پورے زور و شور سے شروع کر دیا اور وہیں سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا جس کے بعد آپ روس گئے۔ اس زمانہ میں روسی مسلمانوں کے حالات بہت خراب ہو رہے تھے۔ زار کی حکومت میں اسلامی آبادی ایک کروڑ چالیس لاکھ کے قریب تھی۔ جو ہر قسم کے ظلم و ستم کا نشانہ بنی ہوئی تھی یہاں تک کہ اس وقت روس میں قرآن مجید اور مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کی اشاعت بھی ممنوع تھی۔ چنانچہ آپ ہی کی کوشش سے یہ ممانعت منسوخ ہوئی۔ اس دفعہ روس میں آپ کا قیام ایک سال سے زیادہ نہیں رہا۔ وہاں سے آپ پھر یورپ کی طرف لوٹے۔ اب ان کا رُخ ترکی اور ایران کی طرف تھا۔ آپ پیرس ہوتے ہوئے بوشہر گئے۔ جہاں تقریباً تین ماہ قیام کیا۔ انہی دنوں شاہ ایران کی طرف سے آپ کو ایک تار ملا جس میں طہران آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ چنانچہ آپ اسی مہینہ طہران تشریف لے گئے

طہران میں حکومت کی طرف سے آپ کا شاندار استقبال کیا گیا۔ مگر بہت جلد ایسے حالات پیدا ہو گئے۔ کہ آپ کو ایران سے رخصت ہونا پڑا۔ اس کے بعد ۱۸۸۷ء میں آپ پھر روس پہنچ گئے۔ اور تقریباً دو سال وہاں رہے۔ اس عرصہ میں وہ بدستور کوشش کرتے رہے۔ کہ افغانستان اور روس کے درمیان اتحاد کرا دیں۔

۱۸۸۹ء میں آپ روس سے جرمنی آئے۔ اور پھر پیرس چلے گئے اس سفر میں آپ کی ملاقات شاہ ایران سے ہو گئی۔ چونکہ شاہ ایران ان دنوں روس کی طرف مائل تھا۔ اور اتحاد چاہتا تھا۔ اس لئے آپ نے شاہ ایران کے اشارہ پر تیسری دفعہ روس کا سفر اختیار کیا۔ اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر طہران واپس آئے۔ مگر اس عرصہ میں وزیر اعظم نے شاہ کو ان کی طرف سے بے پرواہ کر دیا۔ جب آپ نے واپسی پر بدلا ہوا رنگ دیکھا۔ تو آپ کو بہت مایوسی ہوئی۔ ایران کی تاریخ کا یہ زمانہ نہایت تاریک زمانہ تھا۔ ایرانی قوم بربادی و ذلت کی آخری منزل پر تھی آپ نے دیکھا۔ کہ وزیر اعظم اور شاہ دونو ملاقات پر مائل نہیں ہیں۔ تو آپ نے وزیر اعظم کی قومی غداری کا پردہ فاش کرنا شروع کر دیا۔ اور خود طہران کے نزدیک درگاہ شاہ عبدالعظیم میں جا بیٹھے۔ درگاہ میں رہتے ہوئے آپ کو سات مہینے گزر چکے تھے۔ کہ ایک دن بیماری کی حالت میں آپ کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور پچاس سواروں کی حفاظت میں آپ کو خانقین پہنچا دیا گیا۔ گو آپ آخری دفعہ ایران سے رخصت ہو گئے۔ مگر آپ کا لگایا ہوا پودا پروان چڑھتا رہا۔ آپ کی کوششوں کی وجہ سے آج ایران میں آزاد اسلامی سلطنت کا نشان باقی ہے۔

خانقین سے بغداد ہوتے ہوئے آپ لندن آئے۔ اور کچھ عرصہ قیام کے بعد ۱۸۹۲ء میں آپ لندن سے رخصت ہو کر اپنی زندگی کی آخری

منزل کی طرف روانہ ہوئے۔

جس وقت آپ قسطنطنیہ پہنچے۔ دولت عثمانیہ زوال پذیر تھی۔ سلطان عبدالحمید خلافت اسلامی کا تخیل دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔ اور اسی امداد کے لئے وہ آپ کو اپنا حامی بنانا چاہتا تھا۔ اگرچہ آپ کو بخوبی علم تھا۔ کہ سلطان عبدالحمید یہ کام محض اپنے ذاتی اغراض کے لیئے کر رہا ہے پھر بھی آپ نے فراخ دلی سے سلطان کا ساتھ دیا۔ کیونکہ آپ اس طریق سے اسلامی ممالک کو یورپ کی دستبرد سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ آپ کا تخیل وسیع اور عبدالحمید کی نظر تنگ تھی۔ اسی وجہ سے آپ کے اور سلطان کے درمیان بہت دیر تک اتحاد قائم نہ رہ سکا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی واقعات اس قسم کے پیش آئے۔ جس سے سلطان کی بدگمانیاں بڑھتی گئیں۔ حالات کو بھانپ کر آپ نے پھر لندن جانے کی اجازت چاہی۔ لیکن سلطان نے اس خیال سے اجازت نہ دی۔ کہ لندن پہنچ کر آپ اپنے قلم اور زبان سے ترکی کے خلاف پروپیگنڈا کریں گے۔ آپ ترکی میں معزز مہمان کی طرح بلائے گئے۔ اور خطرناک قیدی کی طرح بند کر دیئے گئے۔ انہی ایام میں ناصرالدین شاہِ ایران قتل کر دیئے گئے۔ اس واقعہ نے سلطان کے رہے سہے حواس بھی گم کر دیئے۔ چنانچہ اس وقت سے آپ شاہی مہمان کی بجائے شاہی قیدی بنا دیئے گئے۔ اور پولیس کی کڑی نگرانی میں زندگی بسر کرنے لگے

نظربندی اور پریشانی کی اس حالت میں آپ مرضِ سرطان میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ آپ نے علاج کی غرض سے وی آنا جانے کی اجازت طلب کی۔ مگر سلطان نے انکار کر دیا۔ آخر چند روز مرض کی تکلیفیں برداشت کر کے ۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو انتقال فرمایا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ آپ کی موت کی وجہ بیماری نہیں تھی۔ بلکہ آپ کو سلطان نے زہر دلوایا تھا۔ آپ کی قبر عرصہ تک بے نام و نشان رہی۔ لیکن ۱۹۲۰ء میں ایک امریکن نے

اس کو پختہ کرا دیا۔ ۱۹۴۴ء میں آپ کی نعش مبارک کو استنبول سے افغانستان پہنچانے کا انتظام کیا گیا۔ تاکہ وہاں ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کیا جائے۔ راستہ میں کراچی۔ لاہور اور پشاور میں لاکھوں مسلمانوں اور غیر مسلموں نے شاندار استقبال کیا۔ لاہور میں آپ کی نعش مبارک کو کچھ دیر کے لئے شاہی مسجد کے سامنے ڈاکٹر سر محمدؐ اقبال کی قبر کے پاس رکھ دیا گیا۔ تاکہ یہ دونو رہنما اس عالم میں تھوڑی دیر کے لئے ایک دوسرے کے قریب رہ سکیں۔

سر سیّد

ان کا نام سیّد احمد تھا۔ جب گورنمنٹ انگریزی نے ان کو سر کا خطاب دیا۔ اُس وقت سے یہ "سر سید" کے نام سے مشہور ہو گئے۔ سر سید ہندوستان کے مسلمانوں کے بہت بڑے لیڈر ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے کی بہت زبردست کوشش کی۔ اُور اپنی ساری عمر نہایت خلوص کے ساتھ مسلمانوں کی خدمت کرنے میں گزار دی۔ تعلیمی ترقی آج کل جو کچھ مسلمانوں میں نظر آ رہی ہے اگر سچ پوچھو۔ تو یہ سر سید ہی کا طفیل ہے۔ اس لحاظ سے وہ مسلمانوں کے بہت بڑے محسن تھے۔ علی گڑھ کا مدرستہ العلوم انہی نے قائم کیا تھا جواب بڑھ کر مسلم یونیورسٹی بن چکا ہے۔ وہ ادیب اُور انشاپرداز بھی بہت اعلیٰ درجہ کے تھے۔ اردو زبان کو ترقی دینے میں اُن کا خاص حصّہ ہے۔ انہوں نے ایک سوسائٹی قائم کی تھی۔ جس میں انگریزی سے بہت عمدہ عمدہ کتابوں کے اُردو میں ترجمے ہوئے۔ انہوں نے خود بھی بہت سی کتابیں لکھیں۔ اُن کے زمانہ میں اُردو کو مٹانے کی جو کوششیں ہوئیں۔ انہوں نے بڑے جوش اُور استقلال کے ساتھ اُن کا مقابلہ کیا۔ کتابوں کی تصنیف کے علاوہ انہوں نے اخلاقی۔ مذہبی اُور تعلیمی مضامین بھی مختلف اخباروں اُور رسالوں میں بکثرت لکھے۔ وہ کانگرس کے سخت مخالف تھے۔ اُور انہوں نے ہمیشہ بڑے زور سے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا

کہ وہ کانگریس سے علیحدہ رہیں۔ اور اُس کی کسی تحریک میں حصّہ نہ لیں۔ وہ مسلمانوں کے سچے خیر خواہ تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو ہر اُس بات سے روکا۔ جس میں اُن کا نقصان تھا۔ انہوں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ اور مسلمانوں کی ترقی۔ اصلاح اور عروج میں آخری دم تک بے انتہا کوششیں کی۔ ایسے ان تھک۔ مستقل مزاج اور پر خلوص لیڈر دنیا میں بہت ہی کم ہوتے ہیں۔

سرسید دہلی میں ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو پیدا ہوئے تھے۔ یہ سادات کے بہت معزز قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ میر متقی ان کے والد کا نام تھا۔ جب پڑھنے کے قابل عمر ہوئی۔ تو ایک صاحب شاہ غلام علی کے سپرد کئے گئے۔ اُس زمانہ میں فارسی سرکاری زبان تھی۔ اور انگریزی کو کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ سرسید نے بھی قرآن کریم ختم کرنے کے بعد مولوی حمید الدین سے فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ اس کے بعد کچھ حساب سیکھا۔ کچھ علم ہئیت کا مطالعہ کیا۔ طب کی تھوڑی بہت تعلیم بھی ہر طالب علم کو اُس زمانہ میں دی جاتی تھی۔ طب میں سرسید کے اُستاد حکیم غلام حیدر خاں تھے۔ غرض اٹھارہ برس کی عمر تک سرسید مختلف علوم و فنون کی تعلیم پاتے رہے۔ اس کے بعد باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اور سرسید نے اپنے طور پر کتابیں پڑھ کر عربی اور فارسی کی بہت اچھی لیاقت بہم پہنچا لی۔

سرسید ۲۲ برس کے تھے۔ کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ جس کی وجہ سے ان پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اطمینان اور بے فکری رخصت ہوئی۔ روزی کمانے کا فکر سر پر آ پڑا۔ مجبوراً نوکری کے لئے گھر سے نکلے۔ اور فوجداری کے محکمہ میں سرشتہ دار مقرر ہو گئے۔ آدمی نہایت

لائق - کارگزار - دیانت دار - مستعد اور محنتی تھے - تھوڑے ہی دنوں میں ترقی کر کے یو-پی کے ایک ضلع مین پوری میں جج مقرر ہو گئے کچھ عرصہ بعد ان کا تبادلہ فتح پور سیکری کا ہو گیا - جو آگرہ کے قریب ایک قصبہ ہے -

یہ اس وقت کا ذکر ہے - جب دہلی کے لال قلعہ میں سلطنت مغلیہ کا آخری بادشاہ بہادر شاہ راج کر رہا تھا - ساری سلطنت پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا تھا - مگر قلعہ میں بادشاہ کا حکم چلتا تھا - اور دوسرے شہروں میں بھی ہر شخص بہادر شاہ کا ادب و احترام کرتا تھا - انگریز بھی سارے شاہی آداب بجا لاتے تھے - بادشاہ نے سرسید کو جوادالدولہ عارف جنگ کا خطاب دیا - اور سرسید نے بڑے فخر کے ساتھ اُسے قبول کیا - یہ سرسید کا خطاب تھا - جو اُن کے آباؤ اجداد کو سلطنت مغلیہ کے عروج کے زمانہ میں ملا تھا - اور اب سرسید کو عطا کیا گیا تھا -

فتحپور سیکری کی ججی کے زمانہ میں سرسید نے اپنی سب سے پہلی کتاب لکھی - اس کا نام جلاء القلوب تھا - اور اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا بیان سرسید نے لکھا تھا - اس زمانہ میں جو میلاد نامے لکھے - اور پڑھے جاتے تھے - اُن میں عام طور پر نہایت غلط سلط روائتیں اور حکایتیں لوگ جمع کر دیا کرتے تھے - جن کے پڑھنے اور سننے سے بجائے ثواب کے اُلٹا عذاب ہوتا تھا - سرسید نے اس بات کو محسوس کیا - اور یہ کتاب بڑی محنت سے مرتب کی - جس میں اس امر کا خاص خیال رکھا - کہ ساری روائتیں بالکل سچی اور معتبر بیان کی جائیں - اور کوئی جھوٹی کہانی اور گھڑی ہوئی حکایت کتاب میں نہ آنے پائے - اُس وقت کے لحاظ سے سرسید کی یہ تصنیف بہت قدر کے قابل تھی -

۱۸۴۶ء میں سرسید کا تبادلہ دہلی کا ہوگیا۔ دہلی کے قیام سے پورا فائدہ اٹھاکر انہوں نے نہایت تحقیق اور کمال محنت کے بعد وہ مشہور عالم کتاب لکھی۔ جس کا نام "آثار الصنادید" ہے۔ یہ کتاب دہلی کی تمام قدیم اور شاہی عمارات کی تاریخ ہے۔ اور اپنے رنگ کی بے نظیر تصنیف ہے

دہلی میں اُس وقت بڑے بڑے عالم اور فاضل لوگ موجود تھے اور شہر میں گویا علم کا دریا بہہ رہا تھا۔ سرسید دہلی آئے۔ تو انہوں نے اپنی ادھوری تعلیم کی تکمیل کرنی چاہی۔ مولوی نوازش علی ایک مشہور فاضل تھے۔ مجسٹریٹ اور جج ہونے کے باوجود سرسید نے علم حاصل کرنے میں کوئی شرم نہیں کی۔ اور اُن سے عربی پڑھنی شروع کی۔ ابھی سرسید کو پڑھتے ہوئے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے۔ کہ اُن کی بدلی رہتک ہوگئی۔ سرسید نے مولوی نوازش علی سے عرض کی۔ کہ دل چاہتا ہے۔ کہ ملازمت چھوڑ کر آپ ہی کی خدمت میں پڑا رہوں۔ اور رہتک نہ جاؤں۔ مگر مجبوری یہ ہے۔ کہ پھر کھاؤں کہاں سے؟ اگر آپ مہربانی فرماکر میرے ساتھ رہتک چلیں۔ تو مجھے آپ کی تھوڑی سی خدمت کا بھی موقع مل جائے گا۔ اور آپ کے طفیل میں مجھے علم بھی تھوڑا بہت آجائے گا۔ مولوی صاحب فرمانے لگے۔ کہ "میاں سید" تم اکیلے ہی تو میرے شاگرد نہیں۔ اور بھی بیسوں ہیں۔ اگر میں تمہارے ساتھ رہتک چلا جاؤں۔ تو یہ بیچارے کس کس کے پاس پڑھتے پھریں گے۔ اور کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھائینگے تمہارے اکیلے کے لئے بیسوں طلبا کا نقصان کرنا مجھے گوارا نہیں"۔ سرسید نے ڈرتے ڈرتے ادب سے اُستاد کی خدمت میں عرض کیا۔ کہ اگر حضور چاہیں۔ تو اپنے سارے طلبا کو بھی اپنے ساتھ ہی رہتک لے چلیں۔ ان سب کے کھانے پینے اور رہنے کا خرچ میرے ذمہ ہوگا۔

مولوی صاحب نے فرمایا۔ کہ اگر یہ بات ہے۔ تو پھر چلا چلوں گا۔ چنانچہ سرسید بہت خوش خوش اُستاد کو مع اُن کے تمام طالب علموں کے رہتک لے گئے۔ اور جب تک وہاں رہے۔ سب کے کھانے کپڑے کے ذمہ دار رہے۔ دیکھو علم حاصل کرنے کا شوق سرسید میں کتنا زبردست تھا۔ اور اس شوق میں اُنہوں نے کتنا بجد خرچ برداشت کیا۔

جب ۱۸۵۷ء کا غدر ہوا ہے۔ اُس وقت سرسید بجنور میں مجسٹریٹ درجہ اول تھے۔ اُنہوں نے بڑی جوانمردی اور دلیری کے ساتھ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر بہت سے انگریزوں کی جانیں بچائیں۔ اور اُن کو اپنے ہاں پناہ دی۔ جس سے خوش ہو کر سرکار نے اُن کو ایک ہزار روپے کا خلعت اور دو سو روپے ماہوار کی پنشن دی۔ جھجر کا علاقہ بھی سرکار ان کو جاگیر میں دے رہی تھی۔ مگر وہ انہوں نے نہیں لیا۔

۱۸۷۰ء میں سرسید اپنے لڑکے سید محمود کو کیمبرج یونیورسٹی میں داخل کرانے کے لئے لندن گئے۔ تو ملکہ وکٹوریا نے اُن کو سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب دیا۔ لندن میں انہوں نے ایک نہایت مفید کتاب لکھی۔ جس کا نام خطبات احمدیہ ہے۔ اس میں اُن اعتراضات کے جواب ہیں۔ جو عیسائی لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام پر کرتے ہیں۔

لندن سے واپسی کے بعد سرسید نے اپنا مشہور رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ اس رسالہ میں نہایت عمدہ اخلاقی اور معاشرتی مضامین شائع ہوتے تھے۔ اور سرسید کے تمام بڑے بڑے دوست اس میں مضمون لکھتے تھے۔

علی گڑھ میں جو مسلم یونیورسٹی قائم ہے۔ اس کی بنیاد ۱۸۷۵ء میں سرسید ہی نے رکھی تھی۔ اس مدرسہ کے قائم کرنے اور اُسے ترقی دینے میں سرسید نے تن۔ من۔ دھن سے پوری کوشش کی۔ اور

غالبؒ

اردو زبان کے شاعروں میں جو شہرت اور قبولیت غالب کو حاصل ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ جس قدر خوبصورتی اور نفاست کے ساتھ غالب کا دیوان شائع کیا گیا ہے۔ اتنا کسی اور شاعر کا نہیں کیا گیا۔ جس قدر بے شمار شرحیں غالب کے دیوان کی لکھی گئی ہیں اتنی کسی اور شاعر کی نہیں لکھی گئیں۔ اور جس قدر غالب کے متفرق اشعار ہماری عام بول چال۔ ہماری تحریروں اور ہماری تقریروں میں بولے۔ لکھے اور پڑھے جاتے ہیں اتنے کسی اور شاعر کے نہیں پڑھے جاتے۔ یہ سب باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ غالب اردو زبان کا نہایت ہردلعزیز شاعر ہے۔

غالب کا نام اسد اللہ خاں تھا۔ اپنے نام کی مناسبت سے انہوں نے پہلے اپنا تخلص اسد رکھا۔ اسد کے معنی شیر کے ہیں۔ مگر پھر بدل کر غالب تخلص اختیار کر لیا۔ تخلص اس چھوٹے سے موزوں نام کو کہتے ہیں جو شاعر لوگ

شعروں میں لانے کے لیئے اپنا رکھ لیا کرتے ہیں جیسے سعدی ۔ حالی ۔ ذوق اور داغ وغیرہ۔
غالب کے باپ دادا ترک تھے ۔ اور سمرقند سے ہندوستان آکر آگرہ میں بس گئے تھے یہیں ۸ رجب ۱۲۱۲ھ ہجری کو غالب پیدا ہوئے۔ پانچ سال کے بچے تھے کہ باپ کا انتقال ہو گیا ۔ یہ اپنے چچا مرزا نصراللہ بیگ کے پاس رہنے لگے ۔ جو فوج میں رسالدار تھے ۔ جب چچا بھی مر گئے تو جہاں چچا کے اور وارثوں کی پنشن مقرر ہوئی ۔ وہاں ان کو بھی سات سو روپے سالانہ ملنے لگے ۔
اُس زمانہ میں انگریزی کو تو کوئی جانتا بھی نہ تھا ۔ ہندو مسلمان سب ۔ فارسی ہی پڑھتے اور فارسی ہی لکھتے تھے ۔ غالب نے فارسی ہرمزد نام ایک پارسی سے پڑھی جس نے مسلمان ہو کر اپنا نام عبدالصمد رکھ لیا تھا ۔ عربی صرف و نحو ایک اُستاد شیخ معظم سے حاصل کی ۔
غالب کی ابتدائی عمر آگرہ میں گزری مگر جب بڑے ہوئے تو آگرہ کو چھوڑ کر دہلی میں آن بسے اور باقی عمر یہیں بسر کر دی ۔ دلّی آنے کی وجہ یہ ہوئی کہ ان کی شادی دہلی کے ایک صاحب نواب الٰہی بخش کے ہاں ہوئی ۔ اور اس تعلق کے باعث یہ بھی دہلی میں آن رہے ۔

اُس وقت دہلی کے لال قلعہ میں بہادر شاہ کی حکومت تھی جو مغلیہ سلطنت کا آخری بادشاہ تھا۔ اُس نے ان سے کہا کہ دہلی کے مغل بادشاہوں کی تاریخ اپنی خاص طرز کی فارسی میں لکھو۔ انہوں نے آمادگی ظاہر کی اور بادشاہ نے پچاس روپے ماہوار ان کی تنخواہ مقرر کر دی۔ "مہر نیم روز" کے نام سے ہمایوں تک کا حال لکھا تھا۔ کہ غدر ہو گیا۔

بغاوت دب جانے کے بعد انگریزوں نے دہلی اور اُس کے آس پاس کے علاقے پر وہ وہ ظلم ڈھائے کہ خدا کی پناہ! دلّی کو لوٹ کر برباد کر دیا۔ اور توپوں سے لوگوں کے مکانات کو گرا کر سارے شہر کو کھنڈر بنا دیا۔ دہلی کے تمام معزّز اور شریف آدمی بہت بُری حالت میں گھروں سے نکلے اور جہاں جس کے سینگ سمائے چلا گیا۔ ہزاروں راستے میں مارے گئے۔ سب سے بری حالت لال قلعہ کی تھی شہزادوں اور شہزادیوں پر جو بپتا پڑی وہ خدا دشمن پر بھی نہ ڈالے۔ جن بیگمات نے کبھی محل کی ڈیوڑھی بھی نہ دیکھی تھی۔ اُن کو ننگے پاؤں اور ننگے سر جنگلوں میں بھاگنا پڑا۔ وہ شہزادے جو بڑے ناز و نعمت میں پلے تھے اُن کے سر کاٹ کے طشت میں رکھ کر بادشاہ کے پاس بھیج دیئے گئے۔ خود بادشاہ کو قید کر کے بحالِ تباہ رنگون بھیج دیا گیا۔ اور وہیں بیچارے

کا انتقال ہوا۔

اس افراتفری میں غالب پر بھی ناقابلِ بیان مصیبت پڑی۔ تنخواہ ختم ہوئی پنشن ضبط ہوئی۔ نہ کھانے کو پیسہ رہا۔ نہ بیٹھنے کو ٹھکانہ۔ یہ شکر ہے کہ جان بچ گئی۔ غدر کے بعد یہ بھی گھر سے نکلے۔ کچھ دن کلکتہ میں گزارے۔ کچھ دن لکھنؤ میں رہے۔ چند دن رام پور میں ٹھیرے۔ پھر دہلی چلے آئے اور یہیں ۱۲۸۵ھ ہجری مطابق ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔ درگاہ حضرت شاہ نظام الدین اولیاؒ کے پاس ان کی قبر اب بھی موجود ہے۔

غالب جہاں ایک اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔ وہاں ایک زبردست ادیب اور نہایت قابل انشا پرداز بھی تھے۔ نثر اتنی عمدہ اور دلچسپ لکھتے تھے کہ لوگ آج بھی بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ اردو خطوط اردوئے معلّیٰ کے نام سے چھپے ہیں۔ جو اردو انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہیں یہ وہ خطوط ہیں جو وقتاً فوقتاً اپنے دوستوں اور شاگردوں کو لکھتے۔ مرزا بہت ہی خوش اخلاق۔ بامروّت اور ملنسار شخص تھے۔ جو آدمی ایک دفعہ ان سے مل لیتا دوبارہ ملنے کا آرزو مند رہتا۔ ہر اعلیٰ و ادنیٰ سے نہایت تپاک سے ملتے اور تواضع سے پیش آتے۔ مگر خوددار بھی بہت تھے۔ اور اپنی خودداری کے مقابلہ میں

بڑے سے بڑے نقصان کی پروا نہ کرتے تھے۔ کالج میں فارسی کی پروفیسری کے لیے گورنمنٹ کے سکرٹری نے ان کو ملاقات کے لیے بلایا یہ گئے تو سکرٹری ان کی پیشوائی کے لیے کوٹھی سے باہر نہ آیا۔ یہ بھی اندر نہ گئے بہت دیر کے بعد انگریز سکرٹری باہر آیا۔ پوچھا کہ جب آپ ملاقات کے لیے آئے تھے۔ تو اندر کیوں نہ چلے آئے۔ یہ کہنے لگے اندر کس طرح آتا۔ آپ مجھے لینے کے لیے آئے ہی نہیں۔ وہ بولا "اگر کوئی جلسہ یا دربار ہوتا تو آپ کی شان کے مطابق آپ کا استقبال کیا جاتا مگر اس وقت تو آپ نوکری کے لیے آئے ہیں۔ لہذا وہ تعظیم آپ کی اس حالت میں نہیں ہوگی۔ یہ بولے کہ "سرکاری نوکری کو میں تو عزت بڑھنے کا ذریعہ سمجھا تھا۔ لیکن جب سرکاری نوکری سے باپ دادا کی عزت بھی جاتی رہے تو ایسی نوکری کو دور ہی سے سلام اچھا" یہ کہا اور واپس چلے آئے۔

مزاج میں سخاوت اور دریا دلی بہت تھی اگرچہ خود بڑی تنگی سے گزارہ کرتے تھے مگر جو ضرورت مند آتا اُس کی حاجت جہاں تک ممکن ہو سکتی ضرور پوری کر دیتے۔

نہایت با مذاق اور خوش طبع شخص تھے۔ بات

بات میں لطیفہ پیدا کرتے اور جو آدمی ان کے پاس آتا۔ خواہ کیسا ہی غمگین ہوتا ہنستا ہُوا جاتا۔ شمس العلماء الطاف حسین حالی ان کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ اُنہوں نے اُستاد کی ایک بہت مفصل سوانح عمری نہایت تحقیق اور تلاش سے لکھی ہے۔ جو یادگار غالب کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں سے مرزا کے چند لطیفے اور چٹکلے ہم تمھیں سناتے ہیں۔

غالب کو آم بہت بھاتے تھے۔ ایک روز مجلس میں آموں کا ذکر چلا۔ مولوی فضلِ حق خیر آبادی ایک بڑے فاضل بزرگ تھے وہ غالب سے پوچھنے لگے کہ آپ کے خیال میں آم کی خوبی کیا ہے۔ غالب نے فوراً جواب دیا کہ "بہت ہو اور میٹھا ہو"

حکیم رضی الدین ایک صاحب تھے اُن کو آم بالکل نہیں بھاتے تھے۔ ایک روز یہ غالب کے ہاں کھڑکی کے پاس بیٹھے تھے نیچے گلی میں آم کے چھلکے پڑے تھے اور مکھیاں اُن پر بھنک رہی تھیں۔ ایک گدھا بھی اُدھر سے گزرا اُس نے چھلکوں کو سُونگھا اور چھوڑ دیا۔ حکیم صاحب نے دیکھ کر غالب سے کہا "دیکھئے آم ایسی چیز ہے کہ گدھا بھی نہیں کھاتا۔ غالب بھی غضب کے حاضر جواب تھے جھٹ کہنے لگے "جی ہاں گدھا

نہیں کھاتا۔"

ایک روز بہادر شاہ بادشاہ کے ساتھ آموں کے باغ میں ٹہل رہے تھے۔ اور بار بار للچائی ہوئی نظروں سے درختوں میں لگے ہوئے آموں کو دیکھ رہے تھے۔ بادشاہ نے کہا مرزا! کیا دیکھ رہے ہو! بولے حضور بزرگوں سے سُنا ہے کہ دانہ دانہ پر مہر لگی ہے۔ یہ دیکھ رہا ہوں کہ کسی آم کے دانہ پر میرا نام بھی لکھا ہے کہ نہیں۔ بادشاہ ہنس پڑے اور بہت سے آم ان کے ہاں بھجوا دیے۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جب پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔ جس جاسوس نے بھی انگلی اُٹھا کر کسی کے متعلق کہہ دیا کہ یہ بھی باغیوں میں شامل تھا۔ بلا پوچھ اُس کے گولی مار دی گئی۔ سینکڑوں بے گناہوں کو روز مرہ کوتوالی کے سامنے پھانسیاں دی جاتی تھیں۔ مسلمان دور دور سے گرفتار کر کے لائے جاتے تھے اور بغیر کسی تحقیقات کے پھانسی کے تختے پر چڑھا دیے جاتے تھے۔ غالب بھی پکڑے گئے۔ کرنل براؤن نے فرعونی انداز میں ان سے پوچھا "ول کیا تم مسلمان ہے؟" غالب کی ظریف طبیعت ایسے موقع پر بھی جبکہ جان پر بنی ہوئی تھی لطیفہ گوئی سے باز نہ رہی جھٹ جواب دیا "حضور میں آدھا مسلمان ہوں" انگریز نے تیوری پر بل ڈال کر کہا "وہ کیا مطلب؟"

غالب کہنے لگے "شراب پیتا ہوں سؤر نہیں کھاتا۔" انگریز کو اس لطیفہ پر ہنسی آ گئی اور یہی لطیفہ اُن کی جان بخشی کا باعث ہو گیا۔

غالب ایک دن لیٹے ہوئے تھے۔ یار دوست بیٹھے اِدھر اُدھر کی غپ شپ لڑا رہے تھے۔ ایک شاگرد میر مہدی مجروح نے آگے بڑھ کر اُستاد کے پیر دابنے شروع کیے۔ غالب کہنے لگے "بھئی تو سید ہے مجھے کیوں گناہ گار کرتا ہے؟" میر مجروح کہنے لگے "حضرت آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کے پیسے دے دینا۔ غالب فرمانے لگے "ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اچھا دابو" پیر دابنے کے بعد میر مجروح کہنے لگے "لائیے حضرت! پیر دابنے کے پیسے" غالب بولے۔ "تم نے میرے پاؤں دابے۔ میں نے تمہارے پیسے دابے حساب بے باق ہو گیا۔"

ایک روز بہت مزے کا لطیفہ ہوا۔ سردار مرزا ایک صاحب غالب سے ملنے آئے۔ واپس جانے لگے تو کچھ اندھیرا ہو گیا تھا۔ غالب چراغ لے کر ان کو جوتا دکھانے فرش تک آئے اُن صاحب نے کہا آپ نے کیوں تکلیف فرمائی۔ میں خود ہی جوتا ڈھونڈ کر پہن لیتا۔ غالب بے ساختہ کہنے لگے "جناب! میں آپ کو جوتا دکھانے کے لئے چراغ نہیں لایا۔ بلکہ اس

لیئے لایا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں"۔

غالب نے ایک طوطا پال رکھا تھا۔ ایک روز وہ پروں میں سر دیئے بیٹھا تھا۔ غالب سامنے سے گزرے تو دیکھ کر کہنے لگے "میاں مٹھو تمہارے نہ بیوی نہ بچے۔ تم کیوں فکر مند بیٹھے ہو۔"

دہلی میں غالب مختلف مکانوں میں رہے ہیں۔ آخر عمر میں بلّی ماروں کے محلے میں ہندوستانی دواخانہ کے سامنے مسجد کے پاس مکان کرایہ پر لے لیا تھا۔ اُسی میں رہتے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ آج کل آپ کہاں رہتے ہیں۔ جواب میں بولے ؎

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

حضرت سیّد احمد بریلوی رح

حضرت سیّد احمد بریلوی پچھلی صدی کے بہت مشہور و معروف بزرگ ہوئے ہیں اور اُن کا نام اُن کے کارناموں کی وجہ سے قیامت تک باقی رہے گا۔ آپ کا وطن رائے بریلی تھا جو یو۔پی میں ایک مشہور شہر ہے۔ یہیں آپ ۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ بچپن میں تو آپ گھر ہی پر پڑھتے رہے لیکن جب بڑے ہوئے تو عربی کی اعلیٰ تعلیم کے لیئے دہلی چلے آئے۔ اُس زمانہ میں دہلی میں ایک بہت بڑے فاضل اور بزرگ انسان رہتے تھے جن کا نام شاہ عبدالعزیز تھا۔ ہزاروں آدمیوں نے اُن سے علم پڑھا اور فیض حاصل کیا ہے۔ دہلی آ کر حضرت سیّد احمد بریلوی۔ بھی اُنہی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔

سینکڑوں برس سے ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے مسلمان مذہب اسلام سے ایسے

بیگانہ ہو گئے تھے کہ اسلامی طور طریقوں کو بالکل چھوڑ بیٹھے تھے۔ چنانچہ اُس زمانہ میں بجائے السلام علیکم کہنے کے سلام کا طریقہ یہ تھا کہ آنے والا اپنا نام لے کر کہتا کہ وو میں جو فلاں ہوں ادب سے تسلیمات عرض کرتا ہوں" ظاہر ہے کہ یہ اسلامی طریقہ نہ تھا۔ مگر رواج ہی ایسا پڑا ہوُا تھا۔ بڑے بڑے عالم دین اور بزرگ آدمیوں کے پاس بھی جب لوگ جاتے تو اسی طرح تسلیمات عرض کرتے۔ لیکن چونکہ ہر بڑے چھوٹے اور ہر اعلیٰ ادنیٰ کا یہی دستور تھا۔ اس لیے نہ کسی بزرگ کو اس کے روکنے کا خیال آتا۔ نہ کوئی اس پر برا مناتا مگر اپنے ملک کے رواج کے خلاف حضرت سید احمد مذہب کے نہایت پابند تھے وہ جس وقت حضرت شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں پہلی مرتبہ پڑھنے کے لیے گئے تو انہوں نے بجائے تسلیمات عرض کرنے کے بلند آواز سے السلام علیکم کہا اور ادب سے شاہ صاحب کے سامنے بیٹھ گئے۔ شاہ صاحب چونک پڑے اور فرمانے لگے کہ آج تک جتنے آدمی میرے پاس آئے اُن میں تم سب سے پہلے

آدمی ہو جس نے اسلامی طریقہ سے سلام کیا۔ اچھا آج سے میں یہ قاعدہ مقرر کرتا ہوں کہ جو شخص تسلیمات کہے گا۔ میں اُس کے سلام کا جواب نہ دوں گا۔

قابل اُستاد نے ذہین طالب علم کو نہایت شوق اور محنت سے پڑھایا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں فاضل کر دیا۔ ظاہری علوم سے زیادہ روحانیت کی تعلیم دی اور ایسا کامل کر دیا کہ جب پڑھ کر نکلے تو تھوڑے ہی عرصہ میں اپنے علم اور اپنی بزرگی اور پاکیزگی کی وجہ سے سارے ہندوستان میں مشہور ہو گئے۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے فاضل آدمی آپ سے بیعت ہونے کے لیے آیا کرتے تھے۔ اور اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ہم حضرت سیّد احمد کے مرید ہیں۔ آپ لوگوں کو نیکی اور پرہیزگاری کی تعلیم دیتے اور اس بات کی تاکید کرتے رہتے تھے کہ مسلمان اسلام کے سارے حکموں پر عمل کریں۔ ہزاروں آدمیوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے گناہ کے کاموں کو چھوڑ دیا اور سچے مسلمان بن گئے۔

اُس زمانہ میں سارے پنجاب اور صوبہ

سرحد پر سکھوں کا قبضہ تھا۔ جو سخت متعصب اور وحشی تھے۔ مسجدوں میں گھوڑے باندھتے قرآن شریف کی بے حرمتی کرتے۔ اذان دینے سے منع کرتے اور نماز پڑھنے سے روکتے تھے سب سے بدتر حالت صوبہ سرحد کی تھی۔ حضرت سید احمد بریلوی کا دل ان حالات کو دیکھ کر خون ہو گیا۔ اُن کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ مسلمانوں کو اس مظلومی کی حالت میں دیکھیں۔ چنانچہ اُنہوں نے ایک لشکر جمع کیا اور ۱۸۲۶ء میں اُسے لے کر حیدر آباد سندھ ہوتے ہوئے درہ بولان سے گزر کر افغانستان میں داخل ہوئے پھر وہاں سے درہ خیبر سے نکل کر صوبہ سرحد پر حملہ آور ہوئے۔ اتنا لمبا راستہ اُنہوں نے اس لیے اختیار کیا کہ پنجاب کی طرف سے صوبہ سرحد پر حملہ کرنا بالکل ناممکن تھا کیونکہ سارے راستے میں سکھ ہی سکھ بھرے ہوئے تھے۔ سید صاحب جہاں بے نظیر عالم اور باخدا بزرگ تھے وہاں بہت اعلیٰ درجہ کے بہادر بھی تھے۔ اُنہوں نے صوبہ سرحد میں داخل ہوتے ہی نہایت دلیری اور جوانمردی کے ساتھ سکھوں پر حملے شروع کر دیئے۔ سکھوں کی جمعیت بہت زیادہ تھی

اور اُن کے پاس سامان جنگ بھی بہت تھا۔ مگر حضرت سیّد احمد کسی بات سے نہ ڈرے اور برابر مقابلے پر ڈٹے رہے۔ آخر چھ برس تک جان توڑ مقابلے کرنے کے بعد آپ نے پشاور کو فتح کر لیا۔ جو صوبہ سرحد کا صدر مقام ہے۔ اس فتح سے سارے صوبہ سرحد میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی مل گئی اور وہ بلا روک ٹوک اسلامی احکام بجا لانے لگے۔

مگر بد قسمتی کہو یا بے وقوفی کہ فتح کے بعد خود مسلمانوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ اُنہوں نے بالکل اس بات کی پروا نہ کی کہ کتنی مشکلوں کے بعد ہم کو آزادی کی نعمت ملی ہے۔ ہم اس کی قدر کریں اور آپس کے فضول لڑائی جھگڑوں سے پرہیز کریں، ذاتی مخالفت اور ذاتی دشمنی کے بدلے ایک دوسرے سے لیے جانے لگے اور آپس میں مسلمان ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگے۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت سید احمد کو سخت دُکھ ہُوا۔ اُن کو چاہیئے تھا کہ تلوار لے کر سارے فسادیوں کا خاتمہ کر دیتے۔ مگر اُنہوں نے مسلمانوں کا خون بہانا نہ چاہا۔ اور خود صوبہ سرحد سے اپنے آدمیوں

کو لے کر ہجرت کر گئے۔ مگر تقدیر کو کچھ
اور ہی منظور تھا۔ راستہ میں سکھوں کی ایک
بہت بڑی فوج نے اُن کو گھیر لیا۔ اِن کے
پاس نہ آدمی کافی تھے نہ جنگی ہتھیار کثرت
سے تھے۔ مگر سکھوں کی اطاعت قبول کرنے
سے اُنہوں نے بہادری کے ساتھ لڑ کر مر
جانا بہتر سمجھا۔ چنانچہ آپ اور آپ کے خلیفہ
حضرت شاہ اسماعیل رحمتہ اللہ علیہ بڑی مردانگی
کے ساتھ لڑتے ہوئے بالاکوٹ کے قریب
شہید ہو گئے۔ شہادت کے وقت حضرت
سید احمد کی عمر صرف ۴۵ سال کی تھی۔
یہ حسرتناک واقعہ مئی ۱۸۳۱ء میں واقع
ہُوا۔

حالی

عام طور پر شاعروں کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ جو کچھ زبان سے کہتے ہیں خود اُس پر عمل نہیں کرتے ۔ لوگوں کو لمبی چوڑی نصیحتیں کرتے ہیں مگر اپنے آپ کبھی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ ان نصیحتوں پر چلیں ۔ اسی لیے اُن کی باتوں اور اُن کی نصیحتوں میں کوئی اثر نہیں ہوتا ۔ مگر برخلاف دوسرے شاعروں کے مولانا حالی میں یہ بات نہیں تھی وہ جوکچھ کہتے تھے ۔ کرتے بھی تھے اور اُن کا قول اور فعل بالکل یکساں تھا ۔ اسی لیے اُن کے کلام میں درد بھی ہے اور اثر بھی ۔ اُن کی سوانح عمری دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے جن باتوں سے قوم کو روکا ۔ خود بھی اُنہیں چھوڑ دیا ۔ جس بُرائی سے دوسروں کو منع کیا خود بھی اُس سے الگ رہے ۔ حالی کی یہ حیثیت ایسی ہے کہ انہیں دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہے ۔ وہ قوم کے مصلح اور بہت بڑے معلمِ اخلاق تھے ۔ اُن کو مسلمان کے

تنزل کی حالت دیکھ کر بڑا رنج ہوتا تھا۔ اس لیے اُنہوں نے نہایت پُر درد اور اثر انگیز نظمیں مسلمانوں کو جگانے اور خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیئے لکھیں۔ اور بہت ہی محنت اور خلوص کے ساتھ عمر بھر قوم کی خدمت کرتے رہے۔

مولانا حالیؔ کا نام الطاف حسین تھا۔ شروع میں اُنہوں نے اپنا تخلص خستہؔ رکھا تھا۔ پھر بدل کر حالیؔ کر لیا۔ اُن کے والد کا نام خواجہ ایزو بخش تھا۔ اور وہ مشہور صحابی حضرت خواجہ ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے والدہ کی طرف سے مولانا سید ہیں۔ اور والد کی طرف سے انصاری اُن کے آبا و اجداد میں سے خواجہ ملک علی نام ایک صاحب سلطان غیاث الدین بلبن شاہ دہلی کے زمانہ میں ایران سے ہندوستان آئے تھے۔ بادشاہ نے اُن کو پانی پت میں جو دہلی سے ۵۳ میل پر ایک بہت مشہور قصبہ ہے بہت سی جاگیر دی اور اُن کو شہر کا قاضی بنا دیا۔ مولانا حالی انہی کی اولاد میں سے تھے اور وہ ۱۸۳۷ء میں پانی پت کے محلہ انصار میں پیدا ہوئے۔ بڑے ہو کر پہلے تو اُنہوں نے قرآن شریف حفظ کیا۔ پھر ایک صاحب سے جن کا نام سید جعفر علی تھا د

چار فارسی کی کتابیں پڑھیں۔ ابھی یہ پڑھ ہی رہے تھے کہ ان کی شادی ہو گئی۔ اُس وقت ان کی عمر ۱۷ برس کی تھی۔

شادی کے بعد ہر طرف سے تقاضا ہونے لگا کہ کہیں نوکری کرو۔ خود بھی کھاؤ بیوی کو بھی کھلاؤ۔ مگر اُن کو علم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا۔ یہ چاہتے تھے کہ میں لکھ پڑھ کر عربی اور فارسی کا بہت بڑا عالم بن جاؤں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ پانی پت میں مجھے کنبے والے آرام سے بیٹھ کر علم حاصل نہیں کرنے دیتے تو انہوں نے اس بات کا ارادہ کیا کہ سب سے چھپ کر دلّی چلا جاؤں اور وہاں اطمینان سے علم حاصل کروں۔ جب پڑھ چکوں گا تو واپس چلا آؤں گا۔

یہ سوچ کر مولانا نے بیوی کو تو اُس کے باپ کے ہاں بھیج دیا اور خود چُپکے سے دلّی چل دیئے۔

اُس زمانہ میں سفر کوئی آسان کام نہ تھا کیونکہ نہ ریل تھی نہ پکّی سڑکیں تھیں۔ نہ موٹریں تھیں نہ لاریاں۔ مولانا علم کے شوق میں گھر سے پیدل چلے اور ٹھیرتے ٹھیراتے کئی دن میں دلّی پہنچے اور وہاں ایک بہت بڑے عالم مولوی نوازش علی سے عربی فارسی پڑھنی شروع

کی۔

مولانا گھر سے نہ تو کچھ روپیہ پیسہ لے کر نکلے تھے اور نہ بستر۔ اس لیئے رات کو ایک مسجد کے فرش پر سو رہتے۔ اور جو کچھ رُوکھی سُوکھی مل جاتی کھا لیتے۔ جب کچھ پاس نہ ہوتا تو بھوکے رہتے دیکھو بچّو! علم کتنی محنت سے حاصل ہوتا ہے؟

دلّی اگرچہ پانی پت سے صرف ۵۳ میل پر ہے مگر ریل کے نہ ہونے کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دوسری دنیا میں چلے آئے۔ گھر والوں نے آپ کو بہت تلاش کیا مگر اُن کو پتہ نہ لگا کہ الطاف حسین کہاں گیا؟ ڈیڑھ برس کے بعد معلوم ہوُا کہ دہلی میں ہے۔ اس پر کئی رشتہ دار جمع ہو کر دلّی پہنچے اور مولانا کو زبردستی پانی پت لے آئے۔ ہر چند اُنہوں نے کہا کہ مجھے اطمینان سے یہاں پڑھنے دو مگر کسی نے نہ سُنی اور ان کو مجبوراً گھر واپس آنا پڑا۔ ان کو تعلیم کے چھٹنے کا رنج تو ہوُا مگر دُھن کے پکّے تھے۔ پانی پت آتے ہی پھر کتاب کھول کے بیٹھ گئے۔ اور ڈیڑھ برس تک پڑھتے رہے لیکن کھانے پینے کا فکر ایسی بڑی بلا ہے کہ اُس سے چھٹکارہ محال ہے۔ مجبور ہو کر گھر سے نکلے اور حصار کی کچہری میں ملازم ہو گئے۔ مگر بدقسمتی سے تھوڑے ہی دن کے بعد ہندوستان میں غدر ہو گیا انگریزی عملداری اُٹھ گئی اور ہر طرف قتل و

غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ مولانا حصار سے نکلے اور لٹیروں سے بچتے بچاتے بڑی مشکلوں سے پانی پت پہنچے۔

علم کا شوق بھی عجیب چیز ہوتی ہے۔ دنیا پر تو یہ مصیبت پڑ رہی تھی اور مولانا پانی پت پہنچتے ہی پھر بڑے اطمینان سے علم حاصل کرنے میں لگ گئے۔ اور جو کمی رہ گئی تھی۔ اُسے مولوی ابراہیم حسین انصاری اور مولوی محبّ اللہ اور مولوی قلندر علی زبیری سے پڑھ کر پورا کیا۔

اس کے بعد مولانا دہلی آئے۔ یہاں آپ کی ملاقات نواب مصطفٰی خاں صاحب رئیس جہانگیر آباد سے ہو گئی اور وہ مولانا کو اپنے بچّوں کا اُستاد بنا کر جہانگیر آباد لے گئے۔ نواب صاحب کی صحبت سے مولانا کو بڑا فائدہ ہوا۔ وہ اردو فارسی کے اعلیٰ درجہ کے شاعر۔ بہت بڑے عالم اور اخلاق و عادات کے لحاظ سے ایک بے نظیر شخص تھے۔ حالی بھی علم کے دلدادہ اور بڑے شریف انسان تھے۔ دونوں کی خوب گزاری اور آٹھ سات برس تک بڑے مزے میں زندگی بسر ہوئی۔ مگر جب نواب صاحب کا انتقال ہو گیا تو مولانا دلی چلے آئے۔ یہاں پہنچ کر اُن کو پنجاب کے محکمہ تعلیم میں ایک جگہ مل گئی۔ کام یہ تھا کہ طلباء کے لیئے انگریزی سے جو کتابیں اردو میں ترجمہ

ہوں ۔ اُن کی عبارت کو دیکھ لیں کہ بامحاورہ اور عمدہ ہے یا نہیں؟ کچھ دنوں تک مولانا نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا ۔ مگر اُس زمانہ کا لاہور آج کل جیسا لاہور نہ تھا ۔ اُس وقت یہاں نہ اتنے عالم تھے اور نہ علم کا کچھ چرچا تھا ۔ اس لیئے حالی کا دل یہاں نہ لگا اور اُنہوں نے اپنا تبادلہ دلّی کا کرا لیا ۔ جہاں وہ عربی سکول میں مدرّس ہو کر چلے آئے ۔ اور بہت دنوں تک طلباء کو عربی اور فارسی پڑھاتے رہے ۔ اس زمانہ میں اُنہوں نے مسدّس حالی لکھی ۔ جس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کا ایسا عجیب اور ایسا لاجواب نقشہ کھینچا کہ کمال کر دیا ۔ لوگوں نے اس کتاب کو بڑے شوق سے پڑھا اور حالی اس کتاب کی بدولت سارے ہندوستان میں مشہور ہو گئے ۔

دہلی آنے کے بعد مولانا بہت اطمینان کے ساتھ مضامین لکھنے اور کتابیں تصنیف کرنے میں لگ گئے ۔ اور بہت اچھی اچھی کتابیں لکھیں ۔ نظم بھی اور نثر بھی ۔ اسی دوران میں ریاست حیدر آباد دکن سے اُن کا ایک سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرّر ہو گیا ۔ اس پر اُنہوں نے نوکری چھوڑ دی اور اطمینان سے بیٹھ کر علمی زندگی بسر کرنی شروع کی ۔

ملازمت چھوڑنے پر کئی سال کی محنت کے بعد مولانا نے اپنا دیوان شائع کیا۔ دیوان شاعروں کے کلام کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔ جس وقت دیوانِ حالی شائع ہوا تو ہندوستان میں ایک شور مچ گیا۔ کیونکہ وہ بالکل جدید اور نئی شاعری کا نمونہ تھا۔ دیوان کے ساتھ ہی مولانا نے ایک کتاب اور لکھی جس میں بتایا کہ شعر کسے کہتے ہیں اور وہ کیسا ہونا چاہیئے۔ یہ کتاب اتنی عمدہ ہے کہ فنِ شعر پر آج تک کوئی کتاب اردو میں اس سے بہتر نہیں لکھی گئی۔

دیوان کے شائع ہونے کے چار برس بعد مولانا نے اپنے اُستاد مرزا غالب کی سوانح عمری یادگار غالب کے نام سے لکھی۔ اور اُس کے چار برس بعد سرسیّد کی سوانح عمری حیاتِ جاوید کے نام سے شائع کی جو ایک ہزار صفحہ کی کتاب ہے۔

حیاتِ جاوید کے بعد آپ عام طور سے چھوٹی موٹی نظمیں لکھتے رہے۔ یہاں تک ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو آپ کا انتقال ہو گیا۔ ہماری شاعری میں جو خوبی اور عمدگی حالی نے پیدا کی ہے اور جس طرح اردو شاعری کو تنزل سے نکال کر عروج پر پہنچایا ہے اُس کا احسان، اردو کے ادیب قیامت تک نہیں بھولیں گے

حالی ہمارے زمانہ کے بے نظیر شاعر اور اعلیٰ درجہ کے ادیب تھے۔ وہ قوم کے رہبر اور مسلمانوں کے رہنما تھے۔ انہوں نے اپنی تصنیفات اور اپنی نظموں کے ذریعے قوم کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ اور اُن کا نام اُس وقت تک زندہ رہے گا جب تک اردو زبان دنیا میں موجود ہے۔

(۲۲- فروری سنہ ۱۹۳۹ء)

سعد زاغلول پاشا

مصر میں ایک صوبہ غرابیہ ہے اس کے ایک ضلع ربیان میں ایک متوسط الحال دیندار خاندان بستا تھا ۱۸۶۰ء میں اس خاندان میں ایک ہونہار بچہ پیدا ہوا جو معمار مصر کہلایا یہی سعد زغلول تھے۔

آپ شروع ہی سے نہایت ذہین اور جوشیلے تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم ربیان ہی کے ملک میں ہوئی۔ اس کے بعد آپ کو قاہرہ کی مشہور یونیورسٹی جامعہ ازہر بھیجا گیا یہاں چار برس کی تعلیم کے بعد آپ نے شرعی وکالت کی سند حاصل کی۔

آپ نے اس زمانے ہی میں سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا جب آپ جامعہ ازہر میں پڑھتے تھے۔ ان دنوں اعرابی پاشا مصر میں غیر ملکی مداخلت کے خلاف جد و جہد کر رہے تھے مصر کے نوجوان اور دوسرے ذمہ دار لوگ ان کے حامی بن گئے تھے۔ چنانچہ سعد زاغلول بھی اعرابی پاشا کی جماعت کے ساتھ ہی گئے۔ اور

مظاہروں میں برابر حصہ لیتے رہے۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد آپ ایک نیم سرکاری اخبار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ان ہی دنوں مصر کی حکومت نے برطانیہ کے اشارے پر اعرابی پاشا کی تحریک ختم کرنے کے لئے اعرابی پاشا کو وزیر جنگ بنا دیا۔ ان کے حمایتیوں کے ساتھ آپ کو بھی حکومت کے محکموں میں جگہ ملی یعنی آپ وزیر داخلہ کے معاون مقرر ہوئے اس کے کچھ عرصہ بعد ترقی کر کے صوبہ (غزہ) میں مال کے صدر افسر بن گئے یہ سب کچھ ہوا مگر اعرابی پاشا اور اُن کے ہم درد معاونین سرکاری عہدوں کی رشوت لے کر بھی تحریک روکنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ انہوں نے غیر ملکی اقتدار کے خلاف اپنی جدوجہد کو برابر جاری رکھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ تنگ آ کر حکومت برطانیہ کو مارشل لا نافذ کرنا پڑا جب اس کا بھی اثر نہ ہوا۔ تو برطانیہ نے سعد زاغلول اور ان کے تین ساتھیوں کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا۔

آپ کی گرفتاری سے مصر بھر میں شورش پھیل گئی۔ جگہ جگہ برطانوی افسروں پر قاتلانہ حملے ہوئے۔ ریلوے لائنیں اکھڑ دی گئیں تار کاٹ دیئے گئے۔ مصری پولیس اور فوج نے

عوام پر گولیاں چلانے سے انکار کر دیا۔ سوڈان سے برطانوی فوج بلائی گئی مگر فساد نہ رکا۔

برطانیہ نے اپنی ہر تدبیر کو ناکام دیکھ کر اپنی پالیسی تبدیل کی لارڈ النبی کو جو مصریوں کے حالات سے واقف تھے۔ فوراً مصر بھیجا گیا۔ کہ وہ حالات پر قابو حاصل کر سکیں اور ساتھ ہی یہ بھی اعلان کیا کہ حکومتِ برطانیہ مصر میں عنقریب ایک کمیشن بھیجے گی جو حالات کا جائزہ لے کر اصلاحات کی سفارش کرے گا۔

لارڈ النبی نے مصر پہنچ کر قوم پرستوں سے صلح کر لی اور اپریل ۱۹۱۹ء میں آپ معہ اپنے دوستوں کے رہا کر دئے گئے۔ چنانچہ آپ اپنے رفقا کے ساتھ صلح کانفرس میں مطالبات پیش کرنے کے لئے پیرس روانہ ہو گئے۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی اور مصر میں بے چینی بدستور رہی۔ ان حالات کو دیکھ کر حکومتِ برطانیہ نے جلدی سے ملنر کمیشن مصر بھیجا۔ لیکن مصریوں نے نہ صرف اس کمیشن کا بائی کاٹ کیا بلکہ برطانوی سپاہیوں اور حکومت برطانیہ کے طرف دار وزیروں کی جان پر حملے بھی کیے گئے۔ آخر دو مہینے کی لگاتار گفت و شنید کے بعد لارڈ ملنر اور سعد زغلول کے درمیان سمجھوتہ

ہو گیا۔ لیکن حکومت برطانیہ نے لارڈ ملنر کی سفارشات کو تسلیم نہ کیا۔ بلکہ عدلی پاشا جو مصر کے اعتدال پسندوں کا لیڈر تھا اس سے ایک خفیہ سمجھوتہ کر لیا اس پر لارڈ ملنر کمشن کی صدارت سے مستعفی ہو گیا۔

حکومتِ برطانیہ کے باقاعدہ اعلان کے بعد عدلی پاشا نے اپنی وزارت مرتب کی اور آپ سے سمجھوتہ کرنا چاہا مگر آپ عدلی پاشا سے سمجھوتہ کرنے پر تیار نہ ہوئے۔ آپ کو اصرار تھا کہ مصر اور برطانیہ کی گفت و شنید کی بنیاد وہی سمجھوتہ ہو سکتا ہے جو زاغلول اور ملنر کے درمیان ہو چکا ہے۔ جب کوئی فیصلہ نہ ہوا تو ملک میں پھر شورش پھیل گئی اور عدلی پاشا کی حکومت بدحواس ہو گئی۔ اس پر طرّہ یہ کہ حکومتِ برطانیہ نے عدلی پاشا کے ساتھ مصر کی آزادی کے متعلق جو وعدے کئے تھے انہیں ایفا نہ کیا گیا جب عدلی پاشا کی ساری توقعات پر پانی پھر گیا۔ تو عدلی پاشا بھی مستعفی ہو گیا۔

عدلی پاشا کے استعفیٰ کے بعد مصر میں عجیب صورتِ حال پیدا ہو گئی آپ کے اثر کا یہ عالم تھا کہ سلطان مصر کو کوئی ایسا شخص ہی نہ ملا۔ جو وزیر اعظم کے عہدہ کی ذمے داری قبول کر سکے حکومت برطانیہ نے جب یہ حال دیکھا

تو سعد زاغلول اور اس کے ساتھیوں کو فوراً گرفتار کر لیا۔ اور عدن لے جا کر ان سب کو نظر بند کر دیا لیکن ان گرفتاریوں سے بھی مصر کی بے چینی دور نہ ہوئی۔

جب حالات نے بہت نازک صورت اختیار کی تو حکومت برطانیہ نے لارڈ النبی کی تجاویز کو منظور کر لیا۔ اور مارچ ۱۹۲۲ء میں لارڈ النبی نے مصر واپس آ کر مصر کی آزادی کا اعلان کر دیا۔

اس اعلان کے بعد سلطان مصر نے شاہِ مصر کا لقب اختیار کیا اور ثروت پاشا نے وزارت بنائی مگر کچھ عرصہ بعد حکومت برطانیہ اور مصری وزارت میں اختلاف بڑھا اور نومبر ۲۲ء میں ثروت پاشا مستعفی ہو گئے ان کی جگہ توفیق پاشا نے دوسری دفعہ وزارت بنائی لیکن قوم کو اس وزارت پر اعتماد نہ تھا اس لئے مجبوراً توفیق پاشا بھی مستعفی ہو گئے ان کے بعد یحییٰ ابراہیم پاشا نے وزارت بنائی اور ۹ اپریل ۱۹۲۳ء کو مصر کے لئے جدید دستور کا اعلان کر دیا گیا رفتہ رفتہ حالات اعتدال پر آ گئے اور وزیر اعظم یحییٰ ابراہیم پاشا ملک کا انتظام درست کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ حکومت مصر کے اس اُتار چڑھاؤ کے زمانہ میں سعد زاغلول اور ان کے رفقاء بدستور نظر بند رہے۔ نئے دستور کے مطابق چونکہ مصر میں امن ہو گیا تھا۔ اس لئے

مارشل لا کو ختم کر دیا گیا۔ اور آپ کو رفقا سمیت رہا کر دیا گیا۔ قاہرہ میں آپ کا شاہانہ استقبال ہوا کیونکہ مصر کا نیا دستور در اصل آپ ہی کی سرگرمیوں کا نتیجہ تھا۔

جنوری ۱۹۲۴ء میں نئے دستور کے مطابق انتخابات ہوئے جن میں آپ کی پارٹی کا پلڑا بھاری رہا۔ چنانچہ آپ نے وزیر اعظم بن کر خود وزارت مرتب کی لیکن سوڈان کے متعلق جب حکومت برطانیہ سے جھگڑا پیدا ہوا تو آپ نے استعفیٰ دے دیا۔ لیکن شاہ فواد نے آپ کا استعفیٰ منظور نہ کیا۔

جب سوڈان میں شورش پیدا ہوئی تو مسٹر ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم برطانیہ نے آپ کو لندن بلایا تاکہ گفت و شنید سے اس جھگڑے کو نپٹائیں۔ آپ لندن تشریف لے گئے۔ اور کافی دیر گفت و شنید کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن یہ گفتگو بار آور نہ ہو سکی

آپ دو بنیادی مطالبات پر ڈٹے ہوئے تھے۔ پہلا یہ کہ سوڈان ہمیشہ سے مصر کا ایک صوبہ ہے۔ اس لئے سوڈان مصر کے حوالے کر دیا جائے۔ دوسرا مطالبہ آپ کا یہ تھا کہ حکومت برطانیہ مصری علاقہ سے اپنا فوجی قبضہ اٹھا لے اور صرف سویز کے علاقہ میں اپنا فوجی قبضہ رکھے۔ چونکہ حکومت برطانیہ کسی طرح بھی ان واضح مطالبات

کو ماننے کے لئے تیار نہ تھی اس لئے آپ
ناکام مصر لوٹے۔ اور مصر واپس آتے ہی استعفیٰ
دے دیا۔ لیکن شاہ فواد اس دفعہ بھی آپ
کا استعفیٰ منظور نہ کیا اس اثنا میں سوڈان میں
چند ناگوار واقعات پیش آئے جنگ کی وجہ
سے سعد زاغلول اور برطانوی حکومت کے درمیان
اختلافات بہت بڑھ گئے یہاں تک کہ موجودہ
اسمبلی کا خاتمہ ہو گیا اور مئی ۱۹۲۶ء میں اسمبلی
کا جدید انتخاب شروع ہوا۔ ان دنوں شاہ فواد
کے اشارے سے ایک نئی سیاسی پارٹی اتحاد
کے نام سے بنائی گئی اور اس میں حکومت
کے وزرا اور محل کا عہدے دار شریک ہو گئے
اس پارٹی کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ وفد پارٹی
جو سعد کی پارٹی تھی کہ طاقت کو توڑا جائے
لیکن اس کے باوجود جب انتخابات ختم ہوئے
تو اسمبلی کی ۲۲۰ نشستوں میں سے ۱۵۰ وفد پارٹی
نے حاصل کر لیں۔ وفد پارٹی کی یہ ایسی
زبردست کامیابی تھی جس نے شاہ فواد اور
برطانیہ دونو کو بدحواس کر دیا۔
اور اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ سارا مصر
سعد زاغلول کے ساتھ ہے لیکن اس اکثریت
کے باوجود آپ نے وزارت قبول کرنے سے
انکار کر دیا۔ آپ کے انکار پر عدلی پاشا نے

وزارت بنائی اور آپ ایوانِ نمائندگان کے صدر منتخب ہوئے۔

۱۹۲۷ء کے وسط تک عدلی پاشا وزیر اعظم رہے۔ انہوں نے اعتدال کی پالیسی اختیار کی اور بیک وقت قوم پرستوں شاہ فواد اور برطانیہ کو خوش رکھنا چاہا۔ ان کی یہ دورخی پالیسی عرصہ تک نہ چل سکی آخرکار انہیں مجبور ہو کر استعفیٰ دینا پڑا۔ ان ہی ایام میں مصر کی مدافعتی فوج کی قوت بڑھانے کے مسئلہ پر دونو حکومتوں میں پھر اختلافات ہو گیا۔ حکومت برطانیہ نے شاہ فواد اور اس کے وزیرِ اعظم عبدالخالق کو لندن آنے کی دعوت دی تاکہ گفت وشنید سے معاملہ سلجھایا جا سکے غرض برطانوی وزیر خارجہ سے گفت وشنید کے بعد ایک معاہدہ کا مسودہ تیار ہو گیا۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ معاہدہ مصر پہنچے۔ سعد زاغلول پاشا کا انتقال ہو گیا۔ فقط

مولانا محمد علیؒ

ملک کے جن رہنماؤں نے ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کے لیے۔ کوششیں کی ہیں اُن میں مولوی محمد علی کا نام ہمیشہ یادگار رہے گا۔ وہ ۱۸۷۸ء میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ جو صوبہ یو۔پی میں ایک مشہور ریاست ہے۔ بچپن ہی میں اُن کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ مگر والدہ نے بڑی محنت اور لیاقت کے ساتھ اُن کی پرورش کی اور جب بڑے ہوئے تو اُن کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔

بچپن ہی سے مولانا محمد علی نہایت ہوشیار ذہین۔ چالاک و چوبند اور شریف طبیعت تھے۔ حاضر جوابی اور خوش طبعی اُن کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ کھیل میں بڑی دلچسپی کے ساتھ حصہ لیا کرتے تھے۔ اور اوّل درجہ کے کھلاڑی مانے جاتے تھے۔ لیڈری کا شوق شروع ہی سے تھا۔ جب ہائی سکول میں

پڑھا کرتے تھے اُس وقت بھی اپنے ہم جماعتوں کی ایک ٹولی بنا رکھی تھی اور خود بڑی شان سے اُن پر حکومت کیا کرتے تھے۔ پڑھنے میں محنت کے بالکل عادی نہ تھے۔ سارا سال نہایت بے فکری سے کھیلوں۔ جلسوں۔ کلبوں اور مباحثوں میں مصروف رہتے۔ لیکن جب امتحان قریب آتا تو خوب دل لگا کر محنت کرتے اور بہت اچھّے نمبروں میں پاس ہوتے۔ شروع سے بی۔اے تک اُن کا یہی دستور رہا۔

ہائی سکول کی پڑھائی ختم کرنے کے بعد علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے اور بہت ہی جلد وہاں کے ممتاز طالب علم گنے جانے لگے۔ یہاں اُن کی زندگی بہت خوش و خرم اور بڑے لطف گذری نہایت زندہ دل اور چست و چالاک نوجوان تھے۔ کلاس میں بیٹھتے تو بڑی توجہ سے پروفیسروں کے لکچر سنتے۔ کالج سے فراغت ہوتی تو بے حد دلچسپی کے ساتھ کبھی کرکٹ کھیلتے۔ کبھی فٹ بال۔ یونین میں جاتے تو بڑی دھواں دھار تقریریں کرتے۔ اور بڑے جوش کے ساتھ علمی مباحثوں میں حصہ لیتے غرض بڑے مزے میں زندگی بسر کرتے۔ بیس سال کی عمر میں بی۔ اے کا امتحان دیا اور سارے صوبہ میں اول آئے۔ لوگوں

نے سنا تو حیران رہ گئے کہ وہ لڑکا جس کو کرکٹ اور فٹ بال کے سوا اور کوئی کام ہی نہ تھا۔ امتحان میں کس طرح اول آگیا۔

بی۔ اے کے بعد محمدؐ علی ولایت گئے اور اعلیٰ تعلیم کے لیئے آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخل ہو گئے۔ وہاں سے واپس آکر قوم کی خدمت کے لیئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ دن رات ملک کی آزادی اور قوم کی بہبودی کی فکر میں رہتے۔ اور ان تھک محنت کرتے۔ شروع شروع میں کانگرس کے ساتھ رہے۔ کیونکہ وہ خلوص کے ساتھ سمجھتے تھے کہ ملک کی بھلائی ہندو مسلم اتفاق میں ہے اور ہندستان اُسی وقت آزاد ہو سکتا ہے جب دونوں قوموں میں اتحاد ہو۔ گاندھی جی کو اُبھارنے۔ بڑھانے اور مشہور کرنے میں سب سے زیادہ حصہ مولانا محمدؐ علی کا ہے۔ ورنہ پہلے گاندھی ایک معمولی سے لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ لیکن بہت دنوں کے تجربے کے بعد جب مولانا محمدؐ علی نے یہ بات دیکھ لی کہ کانگرس مسلمانوں کی سخت دشمن اور مخالف ہے۔ اور مسلمانوں کو تباہ اور برباد کرنے کے سوا اُس کا کوئی اور مقصد نہیں۔

نیز یہ کہ وہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر اپنا اُلّو سیدھا کرنا اور مسلمانوں کو بیوقوف بنانا چاہتی ہے۔ تو بہت ہی مجبور ہو کر مولانا محمد علی کانگرس سے الگ ہو گئے۔ اور اپنی ساری کوششیں صرف مسلمانوں کی ترقی اور فلاح میں صرف کر دیں۔

اُنہوں نے محسوس کیا کہ جب تک انگریزی اور اردو میں ایسا اخبار نہ نکالا جائے جس کی آواز کو بڑی وقعت حاصل ہو اُس وقت تک مسلمانوں کا پراپیگنڈہ اچھی طرح نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اُنہوں نے نہایت شان کے ساتھ انگریزی میں کامریڈ اور اُردو میں ہمدرد کے نام سے دو اخبار جاری کیے۔ اُن کے مقالات اور مضامین اتنے پُرزور اور زبردست ہوتے تھے کہ جس موضوع پر مولانا قلم اُٹھاتے تھے سارے ملک کی آواز اُن کے ساتھ ہو جاتی تھی۔ وہ اتنی فصیح و بلیغ انگریزی لکھتے تھے کہ انگریز بھی اُسے پڑھ کر عش عش کر اُٹھتے تھے۔ جس ملکی تحریک کو مولانا نے اپنے ہاتھ میں لیا اُسے نہایت خوبی اور پورے زور کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ وہ مسلمانوں کے بہت محبوب رہنما تھے۔ اور اُنہوں نے اپنی قوم کی خدمت کے پیچھے اپنی ہر چیز کو قربان

کر دیا۔ یہاں تک کہ کام کی کثرت کی وجہ سے صحت بھی کھو بیٹھے۔ گرفتاری اور قید کی مصیبتیں بھی اُٹھائیں۔ اور ہر مشکل کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا۔ انگریز سے مرعوب اور طاقت سے خوفزدہ ہونا اُن کو بالکل نہ آتا تھا۔ نہایت دلیری اور جرأت کے ساتھ انہوں نے انگریزی سلطنت کا مقابلہ کیا اور بڑی بے جگری کے ساتھ آخر تک اس مقابلہ میں ڈٹے رہے۔ کوئی بھی لالچ اور خوف اُن کو اپنے ارادہ سے ہٹا نہ سکا۔ وہ بڑے مستقل مزاج لیڈر تھے اور اُن کی دلی خواہش تھی کہ انگریز کی سلطنت کا جُوا اپنے کندھوں سے اُتار پھینکیں۔ اس خواہش کے حصول میں انہوں نے بڑی بڑی تکلیفیں بہت خوشی سے برداشت کیں اور اُف نہ کی۔ وہ جب گول میز کانفرنس میں شامل ہونے کے لیئے لندن گئے۔ تو اپنی ایک تقریر میں انہوں نے انگریزوں کو مخاطب کر کے کہا کہ "اگر میں واپس اپنے ملک میں جاؤں گا تو آزادی کی نعمت لے کر جاؤں گا۔ میں غلام ملک میں واپس جانا نہیں چاہتا۔ اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ غلام ملک میں مروں۔ بس یا تو میرے ملک کو آزادی دو یا مجھے دو گز زمین قبر

کے لیئے دو"۔ خدا کی عجیب قدرت ہے کہ اُن کا کہنا پورا ہُوا اور ۵ر جنوری ۱۹۳۱ء کو لندن میں حرکت قلب بند ہونے کے باعث اُن کا انتقال ہوگیا۔ اُن کی بیوی۔ اُن کے رشتہ داروں اور ہندوستان کے سارے آدمیوں کی زبردست خواہش تھی کہ اُن کی لاش ہندوستان میں لاکر دفن کی جائے۔ سینکڑوں تار ہندوستان سے اس مضمون کے لندن دیئے گئے کہ جنازہ ہندوستان لایا جائے۔ تاکہ ہمارا محبوب لیڈر ہمارے درمیان دفن ہو۔ مگر بیت المقدس کے مسلمانوں نے بڑے پرزور طریقہ پر اُن کی بیگم صاحبہ کو تار دیا کہ اپنے مرحوم شوہر کی آخری خواہش کا احترام کریں اور ان کو بیت المقدس میں لاکر نبیوں کے اس شہر میں دفن کریں۔ بیگم محمدؐ علی کا دل تو یہی چاہتا تھا کہ اپنے واجب التعظیم شوہر کی لاش کو ہندوستان لے جائیں۔ مگر مسلمانان بیت المقدس کے سخت اصرار سے مجبور ہو گیئں اور اس طرح ہندوستان کا یہ سب سے بڑا اور سب سے زیادہ مخلص لیڈر اُس مقدس شہر میں جہاں سینکڑوں پیغمبروں کی قبریں ہیں ہمیشہ کے لیئے سپرد خاک کر دیا گیا۔ خدا نے اُن کی آخری خواہش کا ایک حصہ تو اُن

کی زندگی ہی میں پورا کر دیا کہ وہ غلام ملک میں واپس نہ گئے اور دوسرا حصہ اُن کی وفات کے ۱۶ سال بعد پورا کیا جب کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو اُن کا ملک انگریز کی غلامی سے آزاد ہو گیا۔ کاش اس وقت محمدؐ علی زندہ ہوتے اور اپنی کوششوں کو پھولتا پھلتا دیکھتے۔

اقبال

موجودہ زمانہ کے شاعروں میں جس قدر شہرت اور عزت اقبال کو حاصل ہوئی ۔ اتنی کسی اور کو نہیں ہوئی ۔ اقبال نہ صرف ہندوستان اور پاکستان کے بلکہ سارے براعظم ایشیا کے بہت بڑے شاعر سمجھے جاتے ہیں ۔ اُن کے کلام کی وجہ سے اُن کی عزت نہ صرف یہاں کے آدمی بلکہ یورپ اور امریکہ تک کے لوگ کرتے ہیں ۔ ایران میں اُن کی فارسی شاعری نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے ۔ اور اُن کی فارسی کتابوں کے ترجمے یورپ کی زبانوں میں ہوئے ہیں ۔ وہ نہ صرف ایک اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے بلکہ بہت بڑے عالم بھی تھے ۔ اُنہوں نے اپنے اشعار کے ذریعہ مسلمانوں کی بڑی خدمت کی ہے ۔ وہ مسلمانوں کے بہت بڑے خیر خواہ تھے اور وہ دل سے چاہتے تھے کہ مسلمان ہر لحاظ سے زیادہ سے زیادہ ترقی کریں اُنہوں نے شاعروں کی پرانی طرز سے ہٹ کر بالکل نئی شاعری اختیار کی ۔ اور سارے ایسے اشعار کہے

جو قوم کی بہبودی اور بھلائی سے تعلق رکھتے تھے اور جن میں مسلمانوں کو اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ وہ مذہبی اور اخلاقی لحاظ سے اپنی اصلاح کریں اور دوسروں کے مقابلہ میں ترقی اور عروج حاصل کریں۔ بڑی حکمت اور موعظت اُن کے اشعار میں پائی جاتی ہے اور اسی وجہ سے وہ "حکیم مشرق" پکارے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو سیاسی لحاظ سے بیدار کرنے میں بھی اُن کا بڑا حصہ ہے۔ اور اُن کی شاعری ایک انقلابی شاعری کہلاتی ہے۔ پاکستان کا خیال اُنہوں ہی نے قوم کے دل میں پیدا کیا۔ اور وہ اس کے بہت پُرجوش حامی تھے۔

آپ کا نام محمدؐ اقبال تھا اور آپ سیالکوٹ میں ۲۲ / فروری ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے آبا و اجداد کشمیری پنڈت تھے۔ سترھویں صدی میں مسلمان ہوئے اور کشمیر کو چھوڑ کر سیالکوٹ میں آ بسے۔

ان کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ مدرسہ میں داخل ہوئے تو ہر امتحان میں نمایاں کامیابی کے ساتھ پاس ہوئے اور وظیفہ حاصل کیا۔ سکول میں آپ بہت ہوشیار اور ہونہار طالب علم سمجھے جاتے تھے طبیعت شروع ہی سے نہایت شاعرانہ اور بامذاق پائی تھی۔ ایک مرتبہ سکول میں اُستاد

نے پوچھا "اقبال دیر میں کیوں آئے؟" انہوں نے برجستہ جواب دیا کہ "جناب! اقبال دیر ہی میں آتا ہے"۔ بچپن ہی سے شمس العلماء مولوی سید میر حسن ان پر نہایت شفقت اور مہربانی فرماتے تھے۔ اُن کی صحبت نے اقبال کو علمی لحاظ سے بے حد فائدہ پہنچایا۔

آپ نے ایف۔اے سیالکوٹ ہی میں پاس کیا۔ اور بی۔اے میں پڑھنے کے لیئے لاہور چلے آئے۔ گورنمنٹ کالج سے آپ نے ۱۸۹۶ء میں ایم۔اے پاس کیا اور یونیورسٹی میں اول آئے۔ کالج میں پروفیسر آرنلڈ جیسے فاضل آپ کے اُستاد تھے۔

ایم۔اے پاس کرنے کے بعد آپ اورینٹیل کالج لاہور میں تاریخ اور فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ یہاں سے پھر آپ گورنمنٹ کالج میں چلے گئے ۱۹۰۵ء میں آپ بیرسٹری کی تعلیم کے لیئے لندن گئے۔ وہاں کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفہ اخلاق کی اور جرمنی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پھر لنڈن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہو گئے۔ تین برس ولایت میں رہے اور ۱۹۰۸ء میں وطن واپس آ گئے۔ یہاں آ کر بیرسٹری شروع کر دی۔ وہ نہایت کامیاب بیرسٹر ثابت ہوئے اور بہت جلد سارے پنجاب میں مشہور ہو

گئے۔ جتنی عمدہ قانونی لیاقت آپ میں تھی اُس سے زیادہ علمی قابلیت کے آپ مالک تھے۔ ۱۹۲۲ء میں آپ کے لیئے گورنمنٹ انگریزی کی طرف سے سر کے خطاب کی تجویز ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ میں اُس وقت تک کوئی خطاب قبول نہیں کروں گا جب تک پہلے میرے اُستاد مولوی میر حسن کو شمس العلماء کا خطاب نہ دیا جائے گا۔ اس پر گورنمنٹ نے اُن کو بھی شمس العلماء کا خطاب دے دیا اس کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور الہ آباد یونیورسٹی دونوں نے اقبال کو ڈی۔ لٹ کی اعزازی ڈگری دی۔

۱۹۲۶ء میں آپ پنجاب کونسل کی ممبری کے لئے کھڑے ہوئے۔ تو بہت زیادہ ووٹوں سے کامیاب ہوئے۔ کونسل میں آپ نے مسلمانوں کی نمائندگی کا پورا پورا حق ادا کیا۔ اور ہر معاملہ میں مسلمانوں کے حقوق کی نگہداشت کی ۱۹۲۸ء میں اسلام پر لکچر دینے کے لیئے مدراس میں آپ کو مدعو کیا گیا۔ یہاں سے آپ میسور گئے اور حضرت سلطان ٹیپو رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ پھر حیدر آباد کی سیر کی۔ اور ۱۹۲۹ء کے شروع میں لاہور واپس آ گئے۔ ۱۹۳۰ء میں آپ مسلم لیگ کے صدر مقرر ہوئے ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس میں شریک ہوتے

کے لیئے انگلستان گئے تو ساتھ کے ساتھ مصر اٹلی - اور فلسطین کی بھی سیاحت کی اور وہاں کی سیاسی اور ادبی محفلوں میں بڑے زبردست لکچر دیئے جن کو نہایت پسند کیا گیا - سنہ ۱۹۳۲ء میں پھر گول میز کانفرنس انگلستان میں ہوئی اُس میں بھی آپ کو بلایا گیا - واپسی پر آپ نے اندلس کی سیر کی اور قرطبہ کی مسجد میں بڑے خشوع و خضوع سے نماز پڑھی - اندلس وہی ملک ہے جہاں مسلمانوں نے آٹھ سو برس تک بڑی شان و شوکت سے حکومت کی ہے مگر آج وہاں ایک مسلمان کا نشان نہیں -

انگلستان سے واپسی کے بعد مختلف اور متعدد بیماریوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوا - کہ آخر اُس نے جان لے کر ہی چھوڑی - ایک آنکھ تو پہلے ہی بیکار تھی دوسری میں بھی پانی اُتر آیا اور دکھائی دینا بند ہو گیا - آواز بیٹھ گئی - کھانسی ہو گئی - ضعف قلب کے دورے پڑنے لگے سانس پھولنے لگا - جگر بڑھ گیا - پاؤں پر ورم آ گیا - اور آخر اردو اور فارسی کا یہ مشہور و معروف شاعر ۲۱ اپریل سنہ ۱۹۳۸ء کو ہم سے ہمیشہ کے لیئے رخصت ہو گیا -

اقبال نے اردو سے بہت زیادہ فارسی میں اشعار کہے ہیں - اُن کا فارسی اور اردو

کلام قوم کو سستی اور غفلت سے بیدار کرنے کے لیئے ایک تازیانہ کا کام دیتا ہے - بلند حوصلگی - بلند خیالی - اور خود داری کے جذبات اُن کے کلام کو پڑھ کر ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتے ہیں - وہ غلامی کو نہایت نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے - اور خودی اور خود داری کو زندگی کا نصب العین سمجھتے تھے - ذاتی طور پر بے حد ملنسار - خوش اخلاق منکسر المزاج اور خوش طبع انسان تھے - امید نہیں کہ سینکڑوں سال کے بعد بھی ایسا باکمال شاعر پیدا ہو - آپ فن شعر میں داغ کے شاگرد تھے - آپ کا مزار لاہور میں شاہی مسجد کے نیچے سیڑھیوں کے قریب بنا ہوا ہے - آپ کی اردو تصنیفات علم الاقتصاد - بانگ درا - بال جبریل اور ضرب کلیم ہیں - آپ کی فارسی کتابوں کے نام یہ ہیں اسرار خودی - رموز بیخودی - پیام مشرق - زبور عجم جاوید نامہ - پس چہ باید کرد - ارمغان حجاز میں اردو اور فارسی کلام دونوں ہیں - ایرانی فلسفہ اور مذہب اسلام کے متعلق آپ کی بعض کتابیں انگریزی میں بھی ہیں جن کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے -

اگرچہ اقبال کی سوانح عمری اُن کی سیرت اُن کے کلام - اُن کی تصنیفات - اور اُن کے

پیغام کے متعلق سینکڑوں مضامین مختلف رسائل اور اخبارات میں اب تک لکھے جا چکے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں لیکن جو کتاب مشرق کے اس شاعر اعظم کے متعلق مولوی محمد طاہر صاحب فاروقی ایم۔ اے نے سیرت اقبال کے نام سے لکھی ہے وہ ہر لحاظ سے مکمل. جامع اور مفصل ہے۔

(۱۷ فروری ۱۹۳۹ء)

(انشا پریس لاہور میں باہتمام ملک مبارک علی چھپوا کر حبیب الرحمن منیجر منصور بک ڈپو اردو بازار نے شائع کی)

